قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام

کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۹	کراچی: ہفتہ - ۲۰ - اگست ۱۹۵۵ء	قیمت چھ آنہ سالانہ پندرہ روپے

قرآن نے کیا کہا ؟

۲ اگست کی اشاعت میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ نظام جس میں ہر شخص اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی کا ذمہ دار خود آپ ہے، کسی دوسرے کو اس سے کوئی سروکار نہیں، غلط ہے۔ صحیح نظام وہ ہے جس میں ہر "چلنے والے" کے رزق کی ذمہ داری "اللہ" پر ہو۔ اسی حقیقت کو اور واضح الفاظ میں یوں بیان کیا کہ۔ ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم (۶/۱۵۲) - تم اپنی اولاد کا مفلسی کی وجہ سے گلا نہ گھونٹ دو۔ تمہارے اور ان کے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اس ذمہ داری کو سورۂ اسرائیل میں یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ۔ نحن نرزقھم وایاکم (۱۷/۳۱) تمہاری اولاد کے اور خود تمہارے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ یعنی ساری دنیا کے نظام کے خلاف، قرآن نے یہ بتایا کہ ہر انسان اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا، اس شخص کی اپنی ذمہ داری نہیں بلکہ "اللہ" کی ذمہ داری ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں آدمی ہیں کہ بھوکے سوجاتے ہیں۔ کروڑوں انسان ایسے ہیں جو خود اور ان کی اولاد ضروریات زندگی سے محروم رہ جاتی ہے۔ جب واقعہ یہ ہے تو پھر "خدا کی ذمہ داری" سے مفہوم کیا ہے؟ (جواب آئندہ قسطوں میں ملاحظہ)۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا عقلِ انسانی، انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے انسان کی راہنمائی کے لئے اس طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی کو اب آسمانی ہدایت کے لئے منزل من اللہ کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ یقیناً غلط ہوگی۔
4. حضور نبی اکرم [illegible] انسانی بصیرت [illegible] ان سب سے صحیح تر اعتبار کرنا چاہئے۔ ہماری تاریخ کے اپنے تمام مقام خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں، بجز غلط اور [illegible] کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس نظام کو ہر زمانے میں اسلامی زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں ہوں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے [illegible] انسان کی [illegible] صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح [illegible] کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ قومی زبان کا مسئلہ ★ چودھری محمد علی صاحب ★ یوم آزادی کا تحفہ ★ [illegible] ★ [illegible]
★ [illegible] اور اسلامی دستور ★ عورت کا قرآن ★ تاریخی شواہد ★ [illegible] ★ مجلس اقبال
★ مسند امام احمد بن حنبل ★ باب المراسلات ★ حقائق و عبر ★ نقد و نظر ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

As. -/6/-

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مد ظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے ہندوستان کی بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔

اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت پہلا حصہ (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے
قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے
کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائیں گے۔

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

جشن آزادی

کی سالانہ تقریبوں پر طلوع اسلام نے جو محاسبے ہر سال لکھے ہیں انہیں۔

جشن نامے

کے نام سے یک جا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کی آزاد زندگی پر قرآنی نقطہ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ ہے۔

اس میں ایسے عنوانات بھی ہیں جو بظاہر مسکراہٹوں کا انداز لئے ہوئے ہیں لیکن در حقیقت خندہ زخم جگر ہیں۔ صفات ۲۵۶ قیمت -/۸/۲ روپے

اسباب زوال امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

قرآنی دستور پاکستان

اب جبکہ پاکستان کا دستور مرتب کرنے کے لئے جدید مجلس دستور ساز مصروف ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کے مطابق کس قسم کا دستور مرتب کیا جاسکتا ہے۔ نیز اب تک جو کوششیں کی گئی ہیں وہ کس طرح قرآن کے تصور کے خلاف تھیں۔

اسلامی آئین پر جامع کتاب۔

صفحات ۲۲۴ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸	ہفتہ ۲۰ اگست ۱۹۵۵ء	نمبر ۳۹

قومی زبان کا مسئلہ

کہنے کو تو جدید مجلس دستور ساز کا اجلاس جولائی کے اوائل ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن دو ایک روز کی نشست و گفتند کے بعد اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ مری کی آب و ہوا اراکین کو راس نہیں آئی۔ اس کے بعد دوسرا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا مگر وہ مشرقی پاکستان کے سیلاب کی وجہ سے ملتوی ہو گیا اور تین مہینوں کے اندر آئین مرتب و مکمل کرنے کے دعوے باندھنے والوں کی دو ماہ کی کارگذاری دیکھ کر ان سے یہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں کہ یہ مستقبل قریب میں سنجیدگی سے اپنے فرائض منصبی کی سرانجام دہی پر توجہ دے سکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا تھا اگر اس مجلس کو محض مجلس آئین ساز رہنے دیا جاتا تو یہ آئین سازی کا اچھا برا کام بہر نوع کرتی لیکن اسے جو مقننہ بھی بنا دیا گیا تو اس کی تمام توجہات سیاسی جوڑ توڑ میں صرف ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بہرحال اس کی تشکیل ہی میں منجملہ دیگر مسائل کے قومی زبان کا مسئلہ پھر سے ابھر کر سامنے آگیا ہے اور سنجیدہ طبقوں کے لئے وجہ پریشانی بن گیا ہے۔ یہ پریشانی بالکل قابل فہم ہے کیونکہ نہ محض استوید آئین کے سلسلہ میں اس مسئلہ کو نپٹانا ہوگا بلکہ یہ وزارتی شکست و ریخت کا بھی جو بہر نوع ایک ہنگامی صورت ہے اساس بن گیا ہے گو اس سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن بنگالی پارٹیوں کی طرف سے بصراحت و تکرار کہا گیا ہے کہ حکومت سے ان کا تعاون اس شرط سے مشروط ہوگا کہ بنگلہ کو بھی اردو کے ساتھ پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔ اگر یہ مبنی بر حقیقت ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہوگا کہ زبان سے متعلق اندر ہی اندر کچھ سمجھوتہ کر لیا گیا ہے۔ اور اگر سمجھوتہ ہو گیا ہے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کیا ہے۔

ایسا سمجھوتہ ہوا یا نہیں، یہ مسئلہ بہرکیف مجلس دستور ساز کے سامنے تصفیہ کے لئے آئے گا۔ بشرطیکہ اس جماعت کو کبھی امور ملکی کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت مل گئی۔ لہٰذا بطور حفظ ماتقدم ہم آج کی فرصت میں اس مسئلہ کو اس کے مناسب پس منظر میں پیش کرتے ہیں، اس مخلصانہ امید کے ساتھ کہ شاید ارکان مجلس دستور ساز کے دل میں یہ بات اتر جائے اور انہیں سیاسی سودا بازی سے بالاتر ہو کر لسانی مسئلہ کو طے کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے۔

لسانی مسئلہ کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کے لئے ہمیں تقسیم سے کچھ پہلے کی سیاست پر بھی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر میں انگریز سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے جو سیاسی جدوجہد شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اس کا محور یہ تصور ہوتا گیا کہ اس میں بسنے والی متفرق و متعدد قومیتیں واحد قوم ہیں متحدہ ہندوستانی قومیت کا یہ تصور قریب قریب مسلم ہو چکا تھا کہ اقبال نے مسلمانوں کے ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہونے کی بنا پر جداگانہ علاقہ کا مطالبہ پیش کیا۔ اس دو قومی نظریئے کا پیش ہونا تھا کہ ہندوؤں نے متحدہ قومیت کے لئے جارحانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی رو سے کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں جو حکومتیں قائم کیں، ان میں انھوں نے سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے سرتوڑ کوششیں کیں کہ مسلمانوں کو وہ "ہندوستانی" بنالیں تاکہ ان کے مطالبہ علیحدگی کی اساس ہی ختم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے خصوصیت سے اردو کی بجائے ہندی زبان کو ہندوستانی کہہ کے رائج کرنا چاہا۔ حکیم الامت کے نفس گرم نے مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسی بجلیاں بھر دی تھیں کہ انھوں نے اس خس و خاشاک باطل کو جلا کر رکھ دیا اور مطالبہ پاکستان پر پہاڑ کی طرح اٹل کھڑے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان مسلمانوں کے مطالبہ آزادی و علیحدگی کی علامت بن گئی۔ چنانچہ پاکستان اور اردو لازم و ملزوم ہم معنی ہو گئے۔ ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمان عام اس سے کہ ان کی مادری زبان کیا تھی اور وہ اردو کو سمجھتے بھی تھے یا نہیں یہی کہا کرتے تھے کہ اردو ان کی ملی زبان ہے اور اس کی ترویج کو وہ اپنی مادری زبانوں پر بھی ترجیح دیں گے۔ آج کوئی ایک بھی قابل ذکر پاکستانی مسلمان لیڈر ایسا نہیں ملے گا جس نے تقسیم سے پیشتر اردو کو اپنی قومی اور مادری زبان نہ کہا ہو اور اس کے تحفظ کو اسلام کے تحفظ کے ہم پلہ نہ سمجھا ہو۔ مسلمانوں کی اردو سے اس شدت سے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کو یہ کہہ کر اردو کے خلاف اکسایا کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اس طرح جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہ ہندو اور مسلمان دونوں کے نزدیک مسلم تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۴۸ء کے شروع میں قائد اعظم نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا تو آپ نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص اردو کے خلاف بات کرتا ہے وہ پاکستان کا غدار ہے۔ اس پر سب نے صاد کیا اور کوئی ایک آواز بھی اس کے خلاف نہ اٹھی۔ لیکن سیاست کے رنگ نرالے ہیں اس کا مدار اصول پرستی پر نہیں مفاد پرستی پر ہے۔ بدقسمتی سے اسلام کے نام لیواؤں نے اسلام کے نام پر وطن بن چکنے کے بعد اسی کمیاؤلی سیاست کو قبول کیا۔ بس پھر کیا تھا، تمام مسلمہ اقدار ختم ہو گئیں۔ کجا یہ حالت کہ تقسیم سے پیشتر دس کروڑ مسلمان متفقہ طور پر یہ دعویٰ باندھتے تھے کہ وہ ایک قوم ہیں اور اس بنا پر جداگانہ وطن کا مطالبہ کرتے تھے اور کجا یہ صورت کہ وطن میسر آجانے پر وہ ان صوبائی وحدتوں میں بٹ کر آپس میں دست و گریبان ہو گئے جو انگریز نے انتظامی امور کی سہولت کی خاطر قائم کی تھیں۔ یہ مصنوعی حد بندیاں اسلام کی عالمگیر صداقتوں کے سامنے سد سکندری بن کر حائل ہو گئیں اور "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ" کے نعروں سے دنیا بھر کو مرعوب کرنے والے بنگالی، پٹھان، سندھی، پنجابی، بلوچی جانے کیا کیا کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ جب وحدت ملت کا تصور ذہنوں سے محو ہوا تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں اس صوبائی تعصب کے ہاتھوں پاکستان میں "بنائے بابل" تعمیر ہوا جسے سابقہ مجلس دستور ساز نے قومی درجہ دے دیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس مجلس نے جو نام نہاد لسانی فارمولا تیار کیا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ پاکستان کی قومی زبانیں اردو اور بنگلہ ہونگی۔ البتہ بیس سال تک سرکاری زبان انگریزی رہیگی نیز اگر کوئی صوبائی اسمبلی مطالبہ کرے تو اس کی صوبائی زبان بھی قومی زبان قرار دی جاسکے گی۔ اس کے ساتھ حکومت پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی تھی کہ وہ ایک مشترکہ زبان تیار کرنے کی کوشش کرے۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئیے!

ایک سے زیادہ قومی زبانوں کا مطالبہ کرنے والے اپنی تائید میں ان ممالک کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں متعدد زبانوں کو قومی درجہ حاصل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کینیڈا، سوئٹزرلینڈ جیسے ممالک موجود ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانوں کو قومی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ارباب سیاست یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ زبان خواہ ایک ہو خواہ زیادہ وہ ملک پر اوپر سے مسلط نہیں کی جاتیں بلکہ اندر سے ابھرتی ہیں کسی زبان کو کسی ملک میں قومی قرار دینا قانون کا کام نہیں بلکہ ایک مسلسل اور تدریجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قانون اس عمل بے پناہ کا فقط اعتراف کرتا ہے

اور بس۔ یعنی عموماً یہ ہوتا ہے کہ قانونی درجہ اختیار کرنے سے پہلے زبانیں عملاً اس مقام کو حاصل کر چکی ہوتی ہیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پاکستان کی قومی زبان کا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ پاکستان ایک تحریک کا نتیجہ ہے۔ اور اس تحریک کا مطالبہ اردو کا تھا لہٰذا اب کسی اور زبان کو (اردو کے ساتھ یا اردو کے علاوہ) قومی درجہ دیدیا جائے تو یہ اُس تحریک سے غداری ہوگی۔ یقیناً کسی لیڈر کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ آج وہ تحریک کے اس اساسی تقاضے کے خلاف جائے۔ جو ایسا کرے گا اسے بجا طور پر تحریک کا غدار کہا جائے گا۔ تعجب ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کو علاقائی خود مختاری کے حق میں صحیفۂ آسمانی سمجھ کر پیش کرنے والے اس بنیادی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسی قرارداد کی رُو سے ملک میں جو تحریک چلائی گئی تھی اس میں اردو کو کیا مقام حاصل تھا۔ اس ناقابل تردید حقیقت کی بناء پر بہ حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان کا مسئلہ پاکستان کی پیدائش سے پہلے طے ہو چکا تھا لہٰذا اس پر مزید بحث و تمحیص لاحاصل ہے۔ لیکن اگر بغرض استدلال اسے تسلیم نہ کیا جائے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جو زبانیں پاکستان میں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے کس کو یا کس کس کو قومی درجے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے بنگلہ کو دیکھئے۔ وہ سراسر علاقائی زبان ہے۔ وہ ایک ہی حصہ میں بولی جاتی ہے۔ اور دوسرے حصے میں اس کا کوئی سمجھنے والا نہیں ملے گا۔ اسی طرح مغربی پاکستان کی زبانیں بھی زیادہ سے زیادہ اپنے اپنے صوبوں تک محدود ہیں لہٰذا ان میں سے بھی کوئی ایک زبان بھی قومی قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ کہنا کہ بنگلہ کے بولنے والے کثیر تعداد میں ہیں قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک تو بنگلہ کے بولنے والے دوسرے حصہ ملک سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہیں۔ دوسرے زبان کا تعین مزاج قومی کے مطابق ہوتا ہے نہ کثرت آراء پر۔ اگر فیصلہ کا مدار رائے شماری پر ہو گیا تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا ہوگا کہ آبادی کی کمی بیشی کے مطابق آئندہ زبانیں بدلتی رہیں۔ بنگلہ کے حامی یقیناً اس صورت حال کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ان کے استدلال کا یہ منطقی نتیجہ ہے ان حالات میں پاکستان کی کوئی ایک علاقائی زبان بھی قومی درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صورت تسلیم کر لی جائے تو ہمارے پیش نظر اردو اور انگریزی دو زبانیں رہ جاتی ہیں۔ ان میں سے اردو کی یہ پوزیشن ہے کہ وہ عربی کے بعد مسلمانوں کی مذہبی زبان کہی جا سکتی ہے۔ مذہبی اس اعتبار سے کہ اس میں مسلمانوں کا اتنا لٹریچر ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی اور زبان میں نہیں ملے گا۔ ایسی زبان کو خیرباد کہنا اپنی قومی علمی میراث سے محروم ہونا ہے یقیناً کوئی باشعور قوم ایسی قربانی نہیں کرے گی۔ دوسری زبان یعنی انگریزی ہماری سرکاری زبان ہے۔ اور بحالات موجودہ اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اسے ایک عرصہ کے لئے ہمیں سرکاری زبان رکھنا ہوگا۔ لیکن اسے قومی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گویا اس طرح بھی محض اردو ہی ہمارے پاس وہ زبان رہ جاتی ہے جسے قومی کہا جا سکے۔

الغرض کسی حیثیت سے دیکھا جائے، اردو سے مفر نہیں لیکن چلئے ہم ان تمام ملحوظات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور فرض کئے لیتے ہیں کہ پاکستان کسی تحریک کا نتیجہ نہیں، بلکہ آج ایک دم اسی ناگفتہ بہ حالت میں معرض وجود میں آگیا جس تک ہماری شامت اعمال نے اسے پہنچایا ہے گویا اس نے آنکھ کھولی تو زبانوں کا ایک رن پڑا ہوا تھا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا آپ جب ایک سے زیادہ قومی زبان پر زور دیتے ہیں تو آپ کے دل میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ تنہا دوسری زبان کو قومی بنا دیا گیا تو آپ اس زبان کے بولنے والوں سے پیچھے رہ جائیں گے یا یہ کہ وہ آپ پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ اگر فی الواقعہ یہ خدشہ موجود ہے تو اس کا یقیناً تدارک ہونا چاہیئے۔ لیکن تدارک کرنے سے پہلے ذرا یہ سوچ لیجئے کہ آپ کس گروہ کے متعلق بات کر رہے ہیں کہ وہ آپ پر غالب آجائے گا۔ کیا یہ وہی لوگ نہیں جنھیں آپ اسلام کی بناء پر اپنا بھائی کہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ آپ کا بھائی آپ پر غلبہ پالے گا! ذرا دل کو ٹٹولئے اور اپنے آپ سے پوچھئے کہ اگر آپ کے بھائی کو حکومت و اقتدار میسر آجائے تو وہ آپ سے کیا سلوک کریگا؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ انھیں اپنے فائدے کے لئے اور آپ کے نقصان کے لئے استعمال کرے گا۔ تو پھر یقین کر لیجئے کہ وہ آپ کا بھائی نہیں بلکہ دشمن ہے۔ آپ اس دشمن سے اولین فرصت میں الگ ہو جایئے۔ کیونکہ جب تک وہ آپ کا دشمن ہے وہ آپ کی زبان ہوتے ہوئے بھی آپ کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کا بھائی ہے اور آپ کو بہرصورت اس کے ساتھ اسی ایک گھر میں رہنا ہے تو پھر آپ ڈر کس بات سے رہے ہیں؟ یہ تنہا اہم ہے کہ آپ اس بھائی کے ساتھ مل کر اسی ایک مکان میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ نے گزشتہ سال لسانی فارمولا تیار کر کے لسانی فوضویت (ANARCHY) کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ ایک زبان کی تشکیل کے لئے کوشاں رہے۔

اگر یہ مسلمہ صحیح ہے تو بات یوں ہو گئی کہ آپ پاکستان کو ایک ملک سمجھتے ہیں اور اس میں بسنے والوں کو ایک قوم اور آپ دل سے چاہتے ہیں کہ اس ملک اور اس قوم کی زبان ایک ہو۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی زبان ایسی نہیں جو تمام باشندوں کی مجموعی زبان قرار دی جا سکے۔ لہٰذا آپ ازراہ احتیاط یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ دو بڑی زبانوں کو بیک وقت قومی تسلیم کر لیا جائے۔ اگر بات یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے نزدیک اردو اور بنگلہ (اور دیگر صوبائی زبانیں) ابھی اس قابل نہیں کہ تنہا طور پر قومی زبان قرار دی جا سکیں اب آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں یہی انسب ہے کہ ہم دو بڑی زبانوں کو لے لیں اور قومی زبان قرار دے دیں؟ کیا اس سے زیادہ بہتر یہ نہیں ہوگا کہ ملک اور قوم کو ذرا اور مہلت دے دیں کہ وہ ایک قومی زبان ڈھال لیں؟ اس کے لئے مدت بھی معین کی جا سکتی ہے۔ یعنی یوں کیا جا سکتا ہے کہ ہم کہہ دیں کہ آئندہ دس یا پندرہ یا بیس سال تک ہم کسی زبان کو قومی قرار نہ دیں اور اس مدت کے بعد دیکھیں کہ کونسی زبان ترقی کر کے اپنے آپ کو قومی بنائے جانے کا مستحق بنا لیتی ہے۔ ایسا کر دیا جائے تو اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس معاملہ میں ایک دوسرے سے لڑیں گے نہیں اور جو قوت اس وقت باہمی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ وہ تعاون میں بدل جائے گی۔ اور ہماری تعمیر کی ضامن ہو جائیگی اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ کوئی زبان آئندہ نسل پر مسلط کرنے کے مجرم نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کو آزاد چھوڑیں گے کہ وہ اپنے وقت کے حالات کے مطابق مناسب فیصلہ کریں اس صورت میں ہمیں عبوری دور کے لئے انتظام کرنا ہوگا اور یہ چنداں دشوار نہیں ہونا چاہیئے۔ سیاسی طور پر ہم ملک کے دو یونٹ بنا رہے ہیں۔ ان دو یونٹوں کے اندر زبان سے متعلق عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔ یعنی مشرقی پاکستان والے بنگلہ چاہتے ہیں اور مغربی پاکستان والے اردو۔ لہٰذا مشرق کی زبان بنگلہ اور مغرب کی اردو۔ اور یہ دونوں حصے باہمی معاملات کے لئے انگریزی استعمال کریں۔ انگریزی ہماری سرکاری زبان ہے اور ابھی برسوں تک سرکاری زبان رہنا ہوگا لہٰذا اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں ایک اور بات غور طلب ہے اور وہ یہ کہ جب ہم پاکستان کو ایک ملک سمجھتے ہیں اور اس میں بسنے والوں کو ایک قوم، اور اس کے لئے ایک ہی زبان رائج کرنے کے متمنی ہیں تو ہمیں ابتداء ہی سے تمام علاقائی زبانوں کا رسم الخط ایک کر دینا ہوگا۔ مسلمانوں کے ہاں یہ رسم الخط سوائے عربی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک رسم الخط سے نہ محض یکسانیت پیدا ہو گی بلکہ اس سے ایک زبان کی تشکیل بھی آسان ہو جائے گی۔

ہمیں توقع ہے کہ اراکین مجلس دستور ساز سیاسی جوڑ توڑ کی گرما گرمی سے الگ ہٹ کر ہماری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور اگر انھیں ملک و ملت کے لئے مفید پائیں گے تو ان پر عمل کرنے سے گریز نہیں کریں گے ہم قارئین سے بھی گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہیں تو اراکین مجلس کو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کریں یعنی ان سے کہیں کہ وہ آئینی طور پر یہ متعین کر دیں کہ پاکستان میں دو زبانیں (اردو اور بنگلہ) قومی زبانیں ہوں گی۔ اس سوال کو سردست غیر متعین رہنے دیں اور عملی کاروبار کے لئے مشرقی پاکستان میں بنگلہ اور مغربی پاکستان میں اردو کو۔ اور باہمی معاملات کے لئے انگریزی کو رائج رہنے دیا جائے۔ اگر ہمارے مجوزہ آئین کی رُو سے دونوں یونٹ زیادہ سے زیادہ حد تک خود مختار قرار پا گئے اور مرکز میں کم از کم معاملات رہ گئے تو پھر مندرجہ بالا تجویز خود بخود استمرار حاصل کرے گی۔

چودہری محمد علی صاحب

۲۰ر اگست کا طلوع اسلام جب پریس میں جا رہا تھا تو اسوقت مرکزی وزارت کی تشکیل کا مسئلہ ہنوز اپنے آپ گل میں تھا لیکن قرآئن سے مترشح ہوتا تھا کہ مسلم لیگ اور عوامی لیگ کا باہمی تعاون ہو جائیگا اور اس طرح مرکز میں ان دونوں کی مخلوط وزارت بن جائے گی۔ ہمارے لئے سب پارٹیاں یکساں ہیں ــــ سگ زرد برادر شغال ــــ لیکن مسلم لیگ اور عوامی لیگ کی مخلوط وزارت نے ہمیں اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ اس سے مرکز اس متحدہ محاذ کے تسلط سے آزاد رہیگا جو ہندو مفاد پرستوں کا ضامن ہے۔ لیکن یہاں کی بساطِ سیاست کے نقشوں کے متعلق تو قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ــــ بعینہٖ جس طرح کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولوی فضل الحق کل کیا ارشاد فرما دیں گے ــــ چنانچہ ہوا یہ کہ مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کا تعاون ہو گیا اور عوامی لیگ حزب مخالف میں چلی گئی۔ اس سے کم از کم ان لوگوں کے خیال کی تائید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ اسوقت پاکستان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو فضل الحق صاحب کی سیاست کا حریف ہو سکے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کے سامنے اپنے دو حریف اور ایک منتہیٰ تھا۔ یعنی مسٹر محمد علی اور مسٹر سہروردی دو حریف۔ اور منتہیٰ یہ کہ وہ خود وزیر اعظم بن جائیں۔ اپنے دونوں حریفوں کو تو انھوں نے لے لیا۔ (قارئین ۲۵ر جون کا طلوع اسلام ملاحظہ کریں جس میں ہم نے لکھا تھا کہ جو محمد علی آج فضل الحق سے اسقدر محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے کچھ تعجب نہیں کہ یہ اسی کے ہاتھوں ایوانِ حکومت سے باہر نکالا جائے) اب اس کے بعد اپنے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے ان کا راستہ صاف ہے۔ وہ عوامی لیگ کے اراکین سے کہیں گے کہ تم نے سہروردی کے پیچھے لگ کر کیا لے لیا؟ نہ صوبے کی وزارت میں تمہارا کوئی حصہ ہے نہ مرکزی کی وزارت میں۔ میری طرف آؤ اور دونوں میں حصے پاؤ۔ بنگال ہموار ہو گیا تو انھیں مغربی پاکستان سے صرف چند آرا کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے وہ یہاں کے محرومین کے ٹولے میں سے پانچ چار کو وزارت پیش کر کے بآسانی اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہمیں بڑا رنج ہوگا کہ ملک چودہری صاحب جیسے کارکن کی خدمات سے محروم ہو جائے گا۔ چودہری صاحب کی کم از کم دو خصوصیات ایسی ہیں جن میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے خلاف ان کا مخالف بھی بددیانتی (CORRUPTION) کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ بیحد محنتی ہیں۔ خدا کرے کہ مولوی صاحب کی سیاست کے متعلق لوگوں کے عام اندازے غلط نکلیں اور ملک چودہری صاحب کی خدمات سے محروم نہ ہونے پائے۔

لیکن اس سے بھی بڑھکر ایک اور خطرہ ہے جس سے ہم محترم چودہری صاحب کو قبل از وقت آگاہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سال میں پاکستان کو جو سب سے زیادہ خطرناک دھکا لگا ہے وہ خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت کے دوران کا واقعہ ہے۔ خواجہ صاحب طبعاً مذہب پرست واقع ہوئے ہیں اس لئے ان کا میلان "علماء" کی طرف زیادہ تھا اور انکے اسی میلان کا نتیجہ تھا کہ مجلس آئین ساز میں آئین کی ناؤ گرداب میں چکر لگاتی رہی اور ساحل مقصود کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھا سکی۔ اور اسی میلان کا نتیجہ تھا کہ ملک کو ۱۹۵۳ء میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنی پڑی جس سے قوم پر وہ تباہی آئی جس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔

چودہری صاحب کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی ہمدردیاں جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں، بلکہ بعض لوگ انھیں اس جماعت کے السابقون الاولون میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اُس احترام کے ساتھ جو چودہری صاحب کے لئے ہمارے دل میں موجود ہے، چودہری صاحب کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ وہ اس کی خاص احتیاط برتیں کہ ان کے یہ میلانات ملک کی سیاست پر اثر انداز نہ ہونے پائیں بالخصوص جب کہ متحدہ محاذ میں نظام اسلام پارٹی بھی شامل ہے جس کا اسلامی جماعت کے ساتھ پورا پورا تعاون ہے۔ جماعت اسلامی اس شوریدہ بخت قوم کو جن تباہیوں کی طرف لئے جا رہی وہ ارباب بصیرت کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ــــ اور ملک اس وقت جس نازک دوراہے پر کھڑا ہے، وہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے ــــ ایسے نازک وقت میں اس قسم کی تخریبی جماعت کا جو لوگوں کے جذبات سے اس بری طرح کھیل رہی ہے ذرا سا جرأت مندانہ اقدام ملک کو تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دینے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ حقیقت چودہری صاحب جیسے بالغ نظر کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی۔

ان توقعات کے ساتھ ہماری آرزو ہے کہ محترم چودہری صاحب اپنوں اور بیگانوں کے تمام خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی محنت اور دیانت سے اس ملک کی بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارنے میں کامیاب ہو جائیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

یوم آزادی کا تحفہ

انیسویں صدی نے دنیا کو جو تباہ کن لعنتیں عطا کیں ان میں سب سے زیادہ ہلاکت انگیز اور انسانیت کش نیشنلزم (وطنیت) کا تصور تھا۔ اس نظریہ کی تفاصیل تو طول طویل ہیں لیکن اس کے ماحصل کو انگریزی زبان کے ان چار الفاظ میں سمیٹ دیا گیا ہے جو وطنیت پرست اقوام کے یہاں "کلمہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی (MY COUNTRY - RIGHT OR WRONG)

اس کا مطلب یہ ہے کہ میری حمایت بہر حال میرے ملک کو حاصل رہے گی۔ خواہ وہ حق پر ہو خواہ باطل پر۔ قومیت پرستی کے اس تصور نے دنیا کو جس جہنم میں دھکیل دیا ہے اس کا اعتراف خود یورپ کی اقوام کو اس شدت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ وہ اب اس "کلمۂ خبیثہ" سے توبہ کی راہیں تلاش کر رہی ہیں اور اس طرح وہ عملاً اس حقیقت کبریٰ کی معترف ہو رہی ہیں کہ اسلام نے اس تصور کو جو انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا تھا تو وہ کسقدر برحق تھا!

یورپ میں تو اس نظریے کے خلاف یہ کچھ ہو رہا ہے اور ادھر حالت ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت کے صدر اعظم میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب نے اپنی مسند نشینی کے بعد یوم آزادی کی پہلی تقریب پر اہل مملکت کو جو تحفہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا ماٹو یہ ہوگا کہ

(MY COUNTRY - RIGHT OR WRONG)

نہ ہوا آج اقبالؒ زندہ جو اس تحفۂ گراں قدر پر گورنر جنرل پاکستان کو صحیح صحیح داد دیتا! وہ اقبال جس نے اس انسانیت سوز نظریہ کے متعلق لکھا تھا کہ۔

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔

اور مسلمان سے تاکید کی تھی کہ

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

وہ زندہ ہوتا تو آج دیکھتا کہ خود اس کے تصور کے پیدا کردہ پاکستان میں اس بت کو کس طمطراق سے نصب کیا جا رہا ہے جسے یورپ اپنے صنمکدوں سے اس پشیمانی سے باہر نکال رہا ہے۔

مرزا صاحب کے پیغام کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالی جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ملک کا مفاد دیگر تمام مقتضیات و مفادات پر مقدم رہنا چاہئیے (اسے انگریزی میں COUNTRY FIRST کہتے ہیں) لیکن انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اپنا مفہوم متعین رکھتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقعہ وہی کچھ کہنا چاہتے تھے جس کی طرف ہم نے ادپر اشارہ کیا ہے تو انھیں اپنا مفہوم واضح کرنا چاہئیے ورنہ ان کے موجودہ جملے سے بے حد غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایک مسلمان کا ماٹو، حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت ہے۔ وہ اپنے ملک کی حمایت بھی اس لئے کرتا ہے کہ وہ حق پرستی کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا ملک باطل کی آماجگاہ ہو رہا ہو تو اس باطل کے استیصال کے لئے انتہائی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ کسی وقت محسوس کرے کہ اس کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں تو وہ ایسے ملک پر ہزار لعنت بھیجکر کسی ایسی سرزمین کا رخ کر لیتا ہے جہاں وہ حق پرستی کا پیغامبر ہو سکے۔

صوبائی عصبیت لعنت ہے، اسے قائم رکھو!

مولوی فضل الحق صاحب نے، یوم آزادی کی تقریب پر قوم کو پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ

بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایسا رجحان زور پکڑ رہا ہے جس کی رو سے برادران پاکستان میں باہمی تفریق کی کوشش کی جاتی ہے اور اہل پاکستان کو اس بنا پر تقسیم کیا جاتا ہے کہ فلاں کس نسل سے ہے اور فلاں کی سکونت کس علاقہ کی ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں ایسی تفریق کے لئے قطعاً گنجائش نہیں کہ فلاں مغربی پاکستان کا ہے اور فلاں مشرقی پاکستان کا۔ میرا یقین محکم ہے کہ اہل پاکستان کو تمام نسلی اور جغرافیائی امتیازات سے بلند ہونا چاہئیے۔

کس قدر بلند اور پاکیزہ تھے یہ ارشادات جن پر ہر طرف سے احسنت کی صدائیں فضا میں گونج اٹھیں۔ لیکن ان صداؤں کا ہنوز ارتعاش ختم نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے (اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کا موجودہ گورنر جنرل بھی غیر بنگالی ہے اور وزیر اعظم بھی غیر بنگالی) اپنے پیغام کا اختتام ان الفاظ پر فرمایا کہ۔

ہمارا موجودہ گورنر جنرل بنگالی اور صرف بنگالی ہے۔ وہ مرشد آباد کے نظامت (شاہی) خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو مغربی بنگال میں واقع ہے ...... یہ نہ صرف بنگالی ہیں بلکہ ان کی رگوں میں شاہی خون بھی دوڑ رہا ہے۔ اس لئے وہ اس منصب بلند کے لئے جس پر وہ اب فائز ہیں دوہری وجوہات کی بنا پر موزوں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اہل بنگال کو اس پر فخر ہے کہ گورنر جنرل انہی میں سے ہیں اور انہی جیسے بنگالی۔

ہاتھ لا استاد! کیوں؟ کیسی کہی؟

ہے کہاں روزِ مکافات؟

کشمیر کا مسئلہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں، پاکستان اس کے بغیر نامکمل نہیں نیم جان ہے اور اگر اس کا الحاق نہ ہوا تو پاکستان کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ لیکن گوزبان و قلم سے قریباً ہر روز یہ دہرایا جاتا ہے کہ کشمیر پاکستان کے لئے موت و حیات کا سوال ہے، اس کی معنویت پر ایمان کا یہ حال ہے کہ مسلسل آٹھ سال سے اس کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جاتا رہا کہ اس کے خاطر خواہ حل کی جملہ امیدیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئی ہیں۔ اس دوران میں ماسوا اس کے کہ ہم نے ہندوستان سے استصواب رائے کے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرائے کوئی ایک پہلو بھی ہماری تسکین کا اس سے نہیں نکلا۔ البتہ ہم نے التوائے جنگ پر اتفاق کر کے ہندوستان کو مہلت دے دی کہ وہ عسکری طور پر پوری طرح کشمیر میں قدم جمائے اور اطمینان سے ریاست کو ہضم کرتا چلا جائے۔ آج کشمیر ہندوستان میں کم و بیش پوری طرح مدغم ہی نہیں ہو چکا بلکہ وہ آبادی کے اعتبار سے ہندو بنتا چلا جا رہا ہے۔ جموں کا صوبہ تو تقسیم کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے قتل عام کے ذریعے مسلم و نابالغ گیا تھا، حالانکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اب باقی علاقوں میں بھی ہندوستان سے غیر مسلم لا لا کر آباد کئے جا رہے ہیں اور انھیں طرح طرح کی مراعات دیکر ریاست کا شہری قرار دیا جا رہا ہے۔ کشمیر کی مسلمان آبادی کو ہندو آبادی میں بدلنے کی تحریک ایسی شدت اختیار کر چکی ہے کہ وہاں کے مقامی باشندے بے پناہ مظالم کے شکار ہوتے ہوئے بھی اس کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ریاست کے اندر استصواب رائے کے فوری انعقاد کا مطالبہ قوت پکڑتا اور تحریک کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ بالکل قابل فہم ہے کیونکہ مظلوم و مقہور باشندگان کشمیر غلامانہ زندگی پر تو بامر مجبوری زہر کے گھونٹ پی کر قناعت کر سکتے تھے لیکن اسے وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی آبائی سرزمین پر ان کا اور ان کی اولاد کا جینا محال ہو جائے۔ غلامی کی صورت میں وہ آزادی کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ہندو استعماریت تو ان کے استبدال و استیصال کی تمہید ہے۔

کشمیر میں یہ کچھ ہو رہا ہے اور ہمارے قائدین روم کے سوائی نیرو کی طرح اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہیں۔ آٹھ سال ٹامک ٹوئیے مارنے کے بعد بڑی مشکل سے سابق وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے یکم اگست کو یہ اعلان کیا تھا کہ انھوں نے مجلس دستور ساز کی تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس میں آزاد کشمیر کے مندوبین بھی شریک ہوں گے اور یہ کانفرنس حکومت کو کشمیر کے بارے میں مشورہ دے گی۔ باوجودیکہ کشمیر کے سلسلہ میں ملک میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا، ہم نے اس اعلان کو غنیمت جانا تھا کہ شائد اس مل بیٹھنے سے مطلوبہ حرکت و عمل کی شکل پیدا ہو جائے۔ اس کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ پاکستان کی مرکزی حکومت بدل گئی۔ اس "انقلاب" کے محرکات کو دیکھا جائے اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے تو اقبال کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسی قوم کو زیب دے سکتا ہے جو صالح کردار سے بیگانہ ہو اور بساطِ زندگی میں جس کے سب مہرے پٹ گئے ہوں۔ اس کے بعد ہر چند نئی ہیئت حاکمہ نے اعلان کیا کہ پیش نظر مسائل میں سے کشمیر کو اولیت حاصل ہے۔ دوسرے ہی دن یہ خبر آ گئی کہ مجوزہ کشمیر کنونشن۔ جس کا انعقاد اسی ہفتے میں ہونا تھا۔ ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ مجلس دستور ساز اچانک ملتوی ہو گئی ہے۔

اب ذرا اس التواء کو دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ یہ مشرقی پاکستان کے سیلاب کی بدولت ہوا ہے لیکن مجلس دستور ساز کے ۱۲ اگست کے اجلاس کی کارروائی پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ مطالبہ عوامی لیگ کی طرف سے ہوا اور ہر چند متحدہ محاذ کے بنگالی اراکین پر بھی سیلاب کا اتنا ہی اثر پڑتا تھا جتنا عوامی لیگ کے ارکان پر لیکن اس کے حق میں صرف آخر الذکر پارٹی کے ارکان بولے۔ کیا بنگال کے دریاؤں نے صرف عوامی لیگ والوں کے مکانوں کو نشانہ بنایا تھا؟ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دن پہلے مسلم لیگ اور عوامی لیگ میں مخلوط وزارت بنتے بنتے ٹوٹ گئی تھی اور عوامی لیگ کی جگہ متحدہ محاذ نے لے لی تھی، اور اب عوامی لیگ کا کام مجلس کے کام میں رخنے ڈالنا ہو گیا تھا؟ ہم سیلاب کی مصیبت کا استخفاف نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری دلی ہمدردی ان بھائیوں کے ساتھ ہے جو اس آسمانی بلا کا شکار ہیں۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتے کہ یہاں سیلاب کو بھی سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا۔

التواء کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کی وجہ سے کشمیر کنونشن کا التواء اور پریشان کن اور تشویشناک ہو جاتا ہے۔ حالت اس عزم کے بعد کی ہے کہ کشمیر کو تمام مسائل پر اولیت حاصل ہے۔ اس پر اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ!

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر؟

خودکشی اور اسلامی دستور

۱۰ اگست کے نوائے پاکستان میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

نیامزنگ (لاہور) سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہاں ایک شادی شدہ خاتون منور سلطانہ نے مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ متوفیہ کا خاوند ریلوے میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہے متوفیہ عرصہ سے پھیپھڑوں اور چھاتی کی بیماری میں مبتلا تھی۔ متوفیہ کے خاوند نے توفیق سے بڑھ کر متوفیہ کی بیماری پر خرچ کر کے اس کا علاج کرایا۔ کہتے ہیں کہ خاوند نے متوفیہ کو لاہور کے تمام اسپتالوں میں داخل کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات سے خاوند سخت پریشان رہنے لگا۔ متوفیہ کو خاوند کی پریشانی کا پوری طرح احساس تھا۔ مرد کے طور پر متوفیہ اپنی پھوپی کے گھر گئی اور وہاں سے بھی واپس گھر آ گئی۔ یہاں متوفیہ کو پھر ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ جس کے بعد خاوند ملازمت پر چلا گیا وہاں سے گھر آیا تو متوفیہ زندگی کا خاتمہ کر چکی تھی۔ متوفیہ کا ایک لڑکا پانچ برس کا اور ایک لڑکی دو برس کی ہے۔

اگر پاکستان کا مجوزہ اسلامی دستور معاشرہ کے اس قسم کے جگر خراش اور روح فرسا حالات کا اطمینان بخش علاج اپنے اندر نہیں رکھتا تو سمجھ لیجئے کہ اسے اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اسلام کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا واحد اور مکمل حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر وہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا اطمینان بخش حل نہیں پیش کر سکتا تو ہمارا یہ دعویٰ کبھی سچا نہیں قرار پا سکتا۔ اسی لئے قرآن نے اس نظام کو پیش کیا ہے جس کی رو سے مملکت میں بسنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔

کیا پاکستان کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والے اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھیں گے؟

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے ۱۳ اگست کا تسنیم آیا جو جماعت اسلامی کا ترجمان ہے۔ اس میں مندرجہ صدر واقعہ کے متعلق ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے۔ اس خط میں وہ (اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد) پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی دردناک کہانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اخبارات انھیں نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں بعض معاصرین نے غریب کی قدیم کہانی کا نام لے کر اس میں اپنے مخصوص مقاصد کے تحت پُر فریب مستقبل اور وعدوں اور امیدوں کا وہ رنگ بھرنا شروع کر دیا ہے کہ جب ذرائع دولت اجتماعی قبضہ میں ہوں گے اور اسکو

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تاریخی شواہد

(۲۷)

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَھُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّھِمْ فَاَخَذَتْھُمُ الصّٰعِقَةُ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ۝ (۵۱-۴۳)

اور (تمہارے لئے اے پیروان دعوت اسلامی) ثمود (کے حالات) میں عبرت ہے۔ جب ان سے کہدیا گیا کہ (تمہارے لئے کچھ مدت تک مہلت ہے۔ چنانچہ) وقتِ معین تک کھاپی لو۔ چنانچہ (وہ اپنے انکار و بدعملی سے باز نہ آئے۔ اور) انھوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی اختیار کی۔ بالآخر انھیں ایک کڑک نے آپکڑا۔ حالت یہ تھی کہ وہ یہ (سب کچھ) دیکھ رہے تھے (مگر کچھ نہ کرسکتے تھے) انھیں کھڑا ہونے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرسکتے تھے۔

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

وَعَادًا وَّثَمُوْدَاْ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِكَ کَثِیْرًا ۝ وَکُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَکُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ۝ (۲۵-۳۸)

اور عاد کو اور ثمود کو اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیان میں بہت سی امتوں کو ہم نے تباہ کردیا (امم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی موثر اور بلیغ) مثالیں بیان کیں۔ (مگر انھوں نے ان سے کوئی اثر نہ لیا اور (جب مکافات عمل کا وقت آ پہنچا، تو) ہم نے ہر ایک کو بالکل ہی برباد کردیا۔

بھلا قانون مجازات کی گرفت سے کوئی چھوٹ سکتا ہے؟

وَثَمُوْدَاْ فَمَا اَبْقٰی ۝ (۵۳-۵۱)

اور (دیکھو تمہارے پروردگار نے) ثمود کو بھی تباہ کردیا۔ چنانچہ اُسے (صفحۂ ہستی پر) باقی نہیں رکھا۔

اور جب جرائم ایسے سنگین ہوں تو ان کی پاداش کی سختی بھی اسی قسم کی ہوگی۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُھْلِکُوْا بِالطَّاغِیَةِ ۝ (۶۹-۵)

چنانچہ ثمود کو دیکھو کہ وہ کس قدر انتہائی دردناک سزا کے ساتھ ہلاک کئے گئے۔

یہ تھا عذاب جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجہ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَھُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ (۲۶-۱۵۸-۱۵۹)

چنانچہ (دیکھو) انھیں قانون مکافات کے عذاب نے آپکڑا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں (نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بڑی) نشانی ہے۔ اور (بات یہ تھی کہ) ان میں سے اکثر (معاندانہ انکار و بدعملی کی وجہ سے قبول حق کی صلاحیت کو کھوچکے تھے اور) ایمان لانے والے نہیں تھے (چنانچہ رحمتِ خداوندی کا یہی تقاضہ ہوا کہ ان کو ہلاک کردیا جائے۔ کیونکہ عضو فاسد کو قطع کردینا ہی بعض اوقات باقی جسم کے لئے باعثِ رحمت ہوا کرتا ہے) بلاشبہ (اے پیغمبر اسلام!) تمہارا پروردگار بڑا ہی غالب اور رحمت والا ہے۔

ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے سامان رزق کو سطح ارض پر بکھیر رکھا ہے لیکن مستبد قوتیں انھیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوق خدا بھوکوں مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا بجھایا گیا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کریں۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی تھیں یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو تباہ و برباد ہونے دیا جاتا۔ اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمتِ خداوندی (خدائی ربوبیت عامہ کی اسکیم) کا تقاضہ یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کردیا جائے۔

سورہ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰھَا ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰھَا ۝ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْیٰھَا ۝ فَکَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْھَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَیْھِمْ رَبُّھُمْ بِذَنْۢبِھِمْ فَسَوّٰھَا ۝ وَلَا یَخَافُ عُقْبٰھَا ۝ (۹۱-۱۱-۱۵)

(اور دیکھو) قوم ثمود نے اپنی (بڑائی) سرکشی کے ساتھ سچائی کو جھٹلایا جب ان کا بدبخت ترین (سرغنہ) کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول نے (آخری اتمام حجت کے طور پر) خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی اور اس کے پانی پینے (کی باری) کے متعلق کہا۔ چنانچہ انھوں نے رسول کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کرڈالا۔ بالآخر ان کے جرائم کی وجہ سے ان کے پروردگار نے ان پر تباہی بھیجدی (اور ایسی تباہی بھیجی کہ) انھیں (تہس نہس کرکے زمین کے) برابر کردیا اور خدا جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا قانون مکافات کسی کو پکڑتا ہے تو) خدا اس خیال سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

آپ آخری آیت پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بذ نسبہم کا ٹکڑا ابھر ابھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شانِ جبروت و کبریائی (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپرواہی اور بدمستی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے۔ جس کی رُو سے نظام کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے جس میں ایک ذرّے سے مقدار سے لے کر عظیم الشان کروں تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال قانونِ جزا و سزا کی گرفت سے کب باہر جاسکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہوسکتے کہ وہ جہاں رحمٰن و رحیم ہے وہاں مالک یوم الدین بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردۂ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا مالک یوم الدین (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکم مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک شائبہ ہے۔ اگر قانون مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہوجائے۔ لہٰذا ولا یخاف عقبھا وہ محور عظیم ہے جس کے گرد تمام نظام کائنات گردش کر رہا ہے۔ خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آ رہی ہے۔ یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے حادثہ کا علم پہلے سے دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر ان لوگوں سے کنارہ کش ہوکر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝ (۷-۷۹)

پھر صالح ان سے کنارہ کش ہوگیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی۔ مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات اور زمانہ جاہلیت کی حیات عقلیہ کی کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ عربوں کی حیات عقلیہ کے مظاہر میں سے لغت اور زبان کا بیان ہوا تھا۔ آج کی صحبت میں ان کی شعر و شاعری کا ذکر جاری ہے جس کا آغاز ۱۰ر اگست کی اشاعت سے ہوا تھا۔

بہرحال یہ دشواری اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کسی مصنف نے عربوں کے ایسے اشعار نقل نہیں کئے جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ عربوں نے ابتداً کس طرح اشعار کہنا شروع کئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ترقی کی اس منزل تک کیسے پہنچے جہاں ہم انھیں دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ادیبوں کو اس نمونہ کے اشعار پسند نہیں آتے تھے اور وہ انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ اگر انھیں ایسے اشعار کے وزن میں کوئی کمزوری نظر آتی تھی تو وہ اسکو درست کر دیتے تھے۔ اس طرح تاریخی معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔

اگر ہمارے پاس وہ ذخیرہ موجود ہوتا جس میں انتخاب سے کام لینے کے بجائے صحت نقل کا زیادہ خیال رکھا جاتا تو وہ بہت سی چیزوں کی تحقیق کرنے کا ایک صحیح ذریعہ بن سکتا تھا۔ انہی چیزوں میں سے حیات عقلیہ بھی ہوتی اور اس سے اس کا صحیح صحیح پتہ لگ سکتا۔ تاہم جو کچھ ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اس سے بھی تھوڑا بہت پتہ ضرور چل سکتا ہے — اگرچہ وہ کافی نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں — جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے مشہور ترین وہ مجموعے ہیں جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں — علماء نے شعراء کے دواوین کو انہی میں سے شمار کیا ہے۔ جو یہ ہیں۔

(۱) معلقات سبعہ۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان کو حماد الراویہ نے جمع کیا ہے۔

(۲) مفضلیات۔ ان کو جمع کرنیوالے مفضل ضبّی ہیں یہ مجموعہ تقریباً ایک سو اٹھائیس قصیدوں پر مشتمل ہے۔

(۳) ابو تمام کا "دیوان الحماسہ" اس میں جاہلی شعراء کے بہت چھوٹے چھوٹے قطعات ہیں

(۴) ایسے ہی بحتری کا "حماسہ"

(۵)۔ "کتاب الاغانی" اور ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء" ان دونوں کتابوں میں جاہلی شعراء کے اشعار اور کثیر قطعات مل جاتے ہیں

(۶) ابن الشجری کی "مختارات"

(۷) ابوزید قریشی کا "جمہرۃ اشعار العرب"

جو اشعار زمانہ جاہلیت کے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سے جو قدیم ترین اشعار ہو سکتے ہیں وہ زمانہ بعثت نبوی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ متجاوز نہیں ہیں۔ ان اشعار کی طرف اگر عام نظر سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ بیشتر ان کے موضوعات وغیرہ میں کوئی تنوع اور معانی و مضامین میں کوئی اچھوتا پن نہیں ہے ان کے جو قصائد نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں ان کی موسیقی یکساں سی ہے جو ایک ہی نغمہ اور ایک ہی گت کو پیش کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات جو ان اشعار میں ملتی ہیں وہ زیادہ تر اکثر قصائد میں مکرر ہوتی ہیں۔ اختراع و نکتہ آفرینی کا بہت کم کہیں نام و نشان ملتا ہے۔ تنوع تو بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان باتوں کو دیکھکر ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔؟

شاعر خیال کرتا ہے کہ وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر سفر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک یا زیادہ رفقائے سفر ہیں۔ راستہ میں کہیں ان احباب کے نشانات پڑ جاتے ہیں جو اب وہاں سکونت پذیر نہیں رہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ان نشانات پر ٹھہراتا ہے اور اپنے ان احباب کے مکانات کے مٹے ہوئے نشانات پر خود بھی آنسو بہاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی رلاتا ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتا ہے جو خوشگواری اور عیش و آرام کے ساتھ اس نے ان احباب کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ان احباب کے بغیر زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ پھر وہ اپنی محبوبہ کا اجمالی یا تفصیلی بیان کرتا ہے۔ اور یہاں سے پھر وہ اپنی اونٹنی یا گھوڑے کی تعریف میں نکل جاتا ہے اور اسے پہاڑی بکرے شتر مرغ یا ہرن سے تشبیہ دینے لگتا ہے۔ یہاں سے پھر وہ یکبارگی سیر و شکار اور اس کی منظر کشی کیطرف نکل جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد پھر وہ اس اصل موضوع کی طرف آتا ہے جس کے لئے اس نے یہ قصیدہ کہا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شجاعت و بسالت کی تعریف کرنے لگتا یا اپنے قبیلہ کے گن گانے لگتا یا اپنے ممدوح کے محاسن شمار کرانے لگتا اور اسکی سخاوت کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ یا کسی ایسی جنگ کا تذکرہ کر کے جس میں اس کی قوم فتحیاب ہوئی تھی فخریہ اشعار کہنا شروع کر دیتا ہے۔ یا کسی قبیلہ کی مذمت اور ہجو کرنے لگتا ہے جس نے اس کے قبیلہ پر دست درازی کی تھی۔ یا پھر اپنی قوم کو انتقام لینے کے لئے جوش میں لاتا اور ابھارتا ہے۔ یا کسی مرنے والے کا مرثیہ پڑھتا ہے یہ — تقریباً یہ کل موضوعات ہیں جن میں جاہلی اشعار کہے گئے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ موضوعات نہایت محدود اور ان کا دائرہ نہایت ہی تنگ ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صحرائی زندگی کا عکس ہی ہوتا ہے اور یہی بدوی زندگی کی سچی تصویر ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے شعراء نکتہ آفرینی اور اچھوتے مضامین پیدا کرنے سے زیادہ اظہار خیال اور لفظوں کے ساتھ کھیلنے پر زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف شعراء نے نظم کا جامہ پہنایا ہے اور اسے مختلف قالبوں میں اس طرح ڈھالا ہے جسے دیکھکر آدمی تعجب سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیق و اختراع یا نکتہ آفرینیاں ہمیں محو حیرت نہیں کرتیں۔ عنترہ نے اس امر کو یوں ادا کیا ہے ؎

شعراء نے کہیں کوئی مکان چھوڑا ہے

یا اس وہم میں گرفتار ہو جانے کے بعد تم اس مکان کو

پہچان بھی سکتے ہو؟

یا مثلاً زہیر نے یوں کہا ہے ؎

"ہم کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ مانگے تانگے مضامین یا بار بار کہے ہوئے الفاظ ہی دہراتے رہتے ہیں"۔

مگر ان لوگوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ شعراء تو بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں قدیم زمانہ سے لوگ شعر کہتے آئے ہیں مگر پھر بھی کہنے کی کافی گنجائش برابر رہی ہے۔ تر و تازہ تخیل برابر نکتہ سنجی و نکتہ آفرینیوں سے کام لیتا اور نت نئے موضوع اور اچھوتے مضامین پیدا کرتا رہا ہے جو ان سے پہلے کسی کو نہیں سوجھے لیکن ان لوگوں نے تو خود ہی اپنے اوپر تنگی کر لی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے معیشتی حالات نے تنگیاں پیدا کر دیں اور انھیں بجز اس کے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ وہ مانگے تانگے مضامین کو دہراتے رہیں۔

نہایت کمی کے ساتھ منتشر طور پر کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں شاعر نے کوئی اچھوتا مضمون پیدا کیا یا نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہو۔ بہت ہی کم ایسے شعراء ہیں جو کسی خاص طرز کے موجد تھے جن میں ان کی اپنی شخصیت واضح طور پر نظر آتی ہو یا ان کے اشعار میں کوئی نیا سُر سنائی دیتا ہو۔ مثال کے طور زہیر کو پیش کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی قوم کی اخلاقیت پر زیادہ زور دیا ہے اور اسکو نہایت سچائی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔

جاہلی اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثر شاعر کی شخصیت اس کے قبیلہ میں گم ہو جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی مخصوص شخصیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ چیز عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شعر مل سکے گا جس میں شاعر کی اپنی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آ سکی ہو۔ جس میں اس نے کوئی ایسا لفظ کہا ہو جس کو اس کے اپنے وجدان کا پتہ لگ سکے۔ بمشکل ہی ایسا کوئی شعر مل سکیگا جسمیں وہ یہ احساس لائے کہ اسے قبیلہ سے الگ اپنے نفس کا کوئی جدا احساس اور شعور ہے۔

عربوں میں جب یہودیت و نصرانیت پھیل گئی تو دینی اور مذہبی طرز کے نئے نغمات نے جنم لیا۔ اس کا نمونہ حیرہ میں عدی ابن زید کے اشعار میں اور پھر طائف میں امیہ ابن ابی الصلت کے اشعار میں مل جاتا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ جاہلیت کے اشعار میں جیسا کہ انداز بیان کی مہارت اور حسن بیان کی ندرت کے اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں، تخیل کی وسعت و تنوع یا احساس و وجدان کی فراوانی کا پتہ اور نشان بھی نہیں مل سکتا۔

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

اب ہم اصل مثنوی کی طرف آتے ہیں اس کا پہلا شعر ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است   ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

یہ تمام عالمِ محسوسات خودی ہی کے اثرات اور کائنات کا وجود خودی ہی کی بنا پہ ہے۔ خودی علت (CAUSE) اور کائنات معلول (EFFECT) ہے اور تمہیں جو کچھ نظر آتا ہے سب خودی ہی کے رموز و اسرار ہیں۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالمِ پندار کرد

خودی نے جب اپنے آپ کو بیدار کیا۔ جب اس میں شعورِ ذات پیدا ہوا تو اس سے فکر کی دنیا وجود میں آگئی۔ اقبال کے نزدیک تخلیق کا پہلا مرحلہ خودی کا شعورِ ذات حاصل کرنا ہے اور اس سے فکر کی دنیا پیدا ہوتی ہے۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او   غیرِ او پیداست از اثباتِ او

خودی کی ذات میں سینکڑوں عالم پوشیدہ ہیں اور اس کے پہلو بدلنے سے نئی نئی دنیائیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس شعر کے پہلے مصرع کا مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبال نے ایک ایسے تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جو فلسفہ کی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا میں قدم قدم پر تضادات ملتے ہیں۔ روشنی کے مقابلہ میں اندھیرا۔ صحت کے مقابلہ میں بیماری آرام کے مقابلہ میں تکلیف۔ تریاق کے مقابلہ میں زہر۔ زندگی کے مقابلہ میں موت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آرام، لذت، روشنی، زندگی جیسی چیزیں خودی ہی کے آثار میں سے ہیں تو ان کے مقابلہ میں تکلیف، بیماری، تاریکی، موت وغیرہ کس کی پیدا کردہ ہیں؟ خیر و شر کی تخلیق کا مسئلہ بہت پرانا ہے اور اس کے متعلق ہر صاحبِ فکر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ بایں ہمہ فکر کی دنیا میں یہ گتھی لاینحل سمجھی جاتی ہے۔ یہ سوال بہت قدیمی اور مشہور ہے کہ "اگر خدا شر کو مٹانے پر قادر ہے لیکن اسے مٹاتا نہیں تو پھر وہ خدا خود غیر مخلص نہیں۔ اور اگر وہ شر کو مٹانے پر قادر نہیں تو پھر اسے قادرِ مطلق نہیں سمجھا جا سکتا۔" یہی وہ عقدۂ مشکل تھا جسے حل کرنے کے لئے مجوسیوں نے تاریکی اور روشنی کو دو مستقل قوتیں تسلیم کر لیا۔ جو کائنات میں ہر وقت برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے نزدیک کارگہِ ہستی اہرمن و یزداں کی ستیزہ کاری ہی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری طرف ہیگل کا فلسفۂ اضداد ہے جس کی رو سے ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ یعنی اگر تاریکی نہ ہو تو ہم روشنی کو روشنی کبھی نہیں کہہ سکتے۔ اس فلسفہ کی رو سے خیر کو خیر سمجھنے کے لئے اس کے مقابلہ میں شر کا وجود لاینفک ہے (یہ مسئلہ بڑا مشکل اور گہرا ہے جس کے حل کرنے کا یہ مقام نہیں۔ اسے معارف القرآن کی آئندہ جلد کے ایک باب میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس جلد کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا" یہ کتاب آجکل پریس میں ہے) بہرحال اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ خودی جب اپنا اثبات کرتی ہے تو اس سے اس کا غیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است   خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

خودی نے دنیا میں عداوت اور خصومت کا بیج بو دیا ہے۔ اس خصومت کی وجہ یہ ہے کہ خودی اس شے کو جو خود اس سے پیدا ہوتی ہے اپنے سے غیر تصور کر لیتی ہے اور اس کے بعد خودی میں اور اس شے میں مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خودی ایسا کیوں کرتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ

سازد از خود پیکرِ اغیار را   تا فزاید لذتِ پیکار را

خودی کے استحکام و ارتقا کا راز مسلسل جد و جہد میں ہے۔ لیکن یہ جد و جہد اسی صورت میں ممکن ہے کہ خودی کے مدِ مقابل کوئی غیر بھی ہو۔ لہٰذا خودی اس کشمکش کو پیدا کرنے اور اس طرح اپنی لذتِ پیکار کو بڑھانے کے لئے خود اپنے غیر کو وجود میں لے آتی ہے۔ اور اس طرح اپنی قوت کا امتحان کرتی رہتی ہے۔

می کشد از قوتِ بازوئے خویش   تا شود آگاہ از نیروئے خویش

خودی اپنے غیر کو پیدا کرتی ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ اور اس طرح اپنے قوتِ بازو کا امتحان کرتی رہتی ہے۔

یہ نکتہ کہ جسے ہم اپنے سے غیر سمجھتے ہیں۔ اس کا وجود خود ہمارا ہی رہینِ کرم ہوتا ہے اقبال کے ہاں جگہ بہ جگہ ملے گا۔ چنانچہ وہ ابلیس کے متعلق لکھتا ہے۔

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند   ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود   ترا از آتشِ ما آفریدند

مجوسی فلسفہ کے تتبع میں ہندو فلسفہ میں بھی روح اور مادہ (آتما اور پراکرتی) کو دو مستقل قوتیں تصور کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مادہ روح کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا رہتا ہے اس لئے مادی دنیا کو ترک کر کے روحانی ترقی حاصل کرتے جانا ہی مقصدِ زندگی ہے۔ روح اور مادہ کی اس کشمکش کے متعلق علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں کہ زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یا نیچر ہے۔ لیکن نیچر شر نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تو وہ ذریعہ ہے جس سے زندگی کی پوشیدہ قوتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

بہرحال اقبال کے نزدیک خودی خود ہی اپنے سے غیر کو وجود میں لاتی ہے اور پھر اسے اپنا غیر سمجھ کر اس سے مصروفِ کشمکش ہو جاتی ہے۔ اور اس کی شکست میں اپنی کامیابی سمجھتی ہے۔ یہ اس کی خود فریبی ہے لیکن

خود فریبی ہائے او عینِ حیات   ہمچو گل از خوں وضو عینِ حیات

خودی کا اس طرح سے اپنے آپ کو فریب دے لینا ہی تو عینِ زندگی ہے۔ جس طرح پھول کے لئے خون سے غسل کرنا اصلِ حیات ہے۔ خودی کا انداز یہ ہے کہ

بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند   از پئے یک نغمہ صد شیون کند

ایک پھول کے نشوو ارتقار کی خاطر وہ سینکڑوں گلستانوں کو برباد کر دیتی ہے۔ وہ محفلِ کائنات میں ایک نغمہ کے اضافہ کے لئے سینکڑوں گھروں کو ماتم کدہ بنا دیتی ہے۔ آپ کائنات کی تخلیق اور اس کے ارتقائی منازل پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ فطرت کو کسی ایک شے کے حسن کو نکھارنے کے لئے کتنے سیلاب اور زلزلے لانے پڑتے ہیں۔ کس قدر کشت و خون اور تاخت و تاراج کرنا پڑتا ہے۔ کس قدر توانائیوں اور ساز و یراق کو ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اس کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ

یک فلک را صد ہلال آوردہ است   بہرِ حرفے صد مقال آوردہ است

وہ ایک آسمان کی رونق کے لئے سینکڑوں ہلال وجود میں لاتی ہے اور ایک نیا حرف پیدا کرنے کے لئے سینکڑوں باتوں کو پیدا کر کے انہیں ضائع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن

عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی   خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

سوال یہ ہے کہ اس قدر اسراف اور اس کی اتنی سنگدلی کے لئے وجہ جواز کیا ہے۔ وجہ جواز یہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو نئی نئی چیزوں کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی کائنات کا حسن اپنی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

واضح رہے کہ آغازِ تخلیق ارتقائے کائنات اور خیر و شر کے متعلق جو کچھ اقبال نے کہا ہے وہ محض فلسفیانہ گفتگو ہے۔ ورنہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے۔ وہ اس باب میں بڑی صاف اور سادہ بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا آغاز اللہ کے عظیم پروگرام کے مطابق اس کے امر سے ہوا۔ یہ اسی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ خیر وہ ہے جو اس قانون کے مطابق ہو اور شر وہ ہے جو اس کے خلاف جائے۔

اقبال اور قرآن
از: پرویز
علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ
قیمت: دو روپے

عورت کا قرآن

(۲۲)

لونڈی سے نکاح

نکاح کے سلسلہ میں دو طرح کی عورتوں کا ذکر آیا ہے ایک "آزاد" دوسری لونڈی"۔ یعنی اگر آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکو تو لونڈی سے نکاح کر لو۔ قرآن مجید میں اور مقامات پر بھی "غلام" اور "لونڈی" کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ ذرا وضاحت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

• غلام اور لونڈی کے ذکر سے ہمارے فقہا اور علماء نے یہ سمجھ اور فرض کر لیا ہے کہ اسلام نے غلامی کو جنگ کی حد تک ہمیشہ اور ہر ابد کے لئے جائز رکھا ہے۔ یعنی اگر مسلمان اور غیر مسلموں میں جنگ ہو اور کامیابی کے سلسلہ میں کچھ بدنصیب "مرد اور عورتیں" مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جائیں تو جس طرح پہلے مرد غلام اور عورت لونڈی بنائے جاتے تھے۔ اسی طرح اب بھی اور ہمیشہ بنائے جا سکتے ہیں۔ نیز ان حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ ان لونڈیوں سے بلا نکاح یا بلا ادائے مہر بیوی کے فرائض بھی ادا کرائے جا سکتے ہیں۔ یہ خیال، یہ عقیدہ، یہ مفروضہ اور یہ اصرار محض غلط اور سراسر بالکل ناطل ہے۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر حالت میں قطعاً منسوخ ختم اور کالعدم کر دیا ہے اور چونکہ دوسری شق کا دار و مدار اور انحصار پہلی شق ہی پر ہے۔ لہٰذا وہ بھی سرے سے مہمل ہے۔ اسلام کی تعلیم کی رو سے کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی، کوئی "مرد غلام اور کوئی عورت لونڈی" نہیں بنائی جا سکتی۔ اور اس طور پر لونڈی کو بلا نکاح کا مسلمانوں کے لئے فی زمانہ یا آئندہ کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا ہے چونکہ "عورت" پر یہ ایک ایسا ذلیل جبر ہے۔ جس سے خدا نے تو عورت کو نجات دیدی ہے۔ مگر ہمارے فقہا اور علماء اس لعنت کو قائم اور جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں یہاں ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گی۔

قرآن مجید کے نزول کے وقت عرب میں غلامی کا عام رواج تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے پاس بھی لامحالہ ایام جاہلیت کے لاتعداد غلام اور لونڈی موجود تھے۔ قرآن مجید نے "ملکت ایمانکم" (غلام۔ لونڈیاں) سے، لفظی طور پر صرف عہد جاہلیت کے یعنی اسلام سے قبل کے وہ غلام اور لونڈی مراد لئے ہیں

• جو ملکیت میں آچکے ہیں:

نہ یہ کہ: جو ملکیت میں اب آویں: اسی لئے قرآن مجید نے ان کے متعلق ایسا طرز عمل اختیار کیا۔ جس سے وہ مجبور و بے بس مرد و عورت آہستہ آہستہ اسلام کے آزاد معاشرہ میں جذب ہوتے چلے گئے۔ کہیں خود ان کو حق دیا کہ وہ نقد یا کسی مدت کے اندر فدیہ ادا کر کے آزاد ہو جائیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ کفاروں میں لونڈی غلام آزاد کر دیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو بیوی بنا لینے کا حکم دے کر ان کو آزاد عورتوں کا سا درجہ دے دیا اور ایسا ربط پیدا کر دیا کہ ان کے مالکوں کو ان سے دماغی ہی نہیں دلی تعلق بھی پیدا ہو جائے۔ مگر چونکہ لونڈیوں، غلاموں کو آزاد کرنے اور سلسلہ مناکحت قائم کرانے سے بھی تمام غلاموں اور ساری لونڈیوں کی کھپت مشکل تھی۔ اس لئے عام طور پر ان سے حسن سلوک کا حکم دیا۔ تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ ہونے پائیں۔ اور ان سے احساس کمتری کا مرض دور ہو جائے۔

ہندوستانی اور پاکستانی علماء ہنوز دعوے کرتے اور ابھی تک سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اسیران جنگ کو اب بھی "غلام" اور "لونڈی" بنایا جا سکتا ہے اور اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی عالم مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی فرماتے ہیں کہ:۔

> "اسلام نے . . . . غلامی کی صرف ایک صورت کو جائز رکھا ہے وہ یہ کہ جب مسلمانوں کے ساتھ مشرک و کافر برد آزما ہوں۔ اور امن و سلامتی کے بجائے فتنہ و فساد اور شر انگیزی کو مایۂ خمیر بنا لیں تو وہ باغی قرار دیئے جا کر قید ہو جانے کے بعد "غلام" بنائے جا سکتے ہیں:
>
> (اخلاق و فلسفۂ اخلاق صفحہ ۲۹۰)

پاکستانی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بڑی طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں:۔

> "اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہوں تو مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھ لیں:۔
>
> (تفہیمات حصہ دوئم صفحہ ۲۹۳)

دراصل یہ غلط فہمی شروع ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اور اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کہ متقدمین کی رایوں کا جائزہ لیا جائے۔ فی زمانہ لوگوں کے لئے یہ جاننا قطعاً ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ خدا نے کیا کہا ہے۔ رسول نے کیا فرمایا ہے۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ متقدمین نے کیا لکھا ہے۔[1] چنانچہ خود مودودی صاحب نے یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے کے سوال پر جو کچھ جواب دیا تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ان حضرات کے[2] نزدیک صداقت کیا ہے! فرماتے ہیں۔

> اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے۔ لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں۔ اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے:
>
> (رسالہ ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء)

یعنی اگر سلف سے خلف تک فقہائے امت "دو اور دو کو تین" کہتے آئے ہیں۔ تو فی زمانہ اس کے خلاف یہ رائے دینا مشکل ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اور پہلے کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر سے کیجئے۔ وہ اپنی کتاب "ترجمان القرآن" جلد اول کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

> چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی اس دماغی عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا۔ کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟"
>
> (صفحہ ۱۴)

یہ قرآن مجید کی تفسیروں کا حال تھا۔ پھر بھلا فقہی مسائل کا کیا پوچھنا ہے۔ جب کہ خدا کے کلام کے مقابلے میں انسانی کلام کا کوئی درجہ نہیں ہے؟ اس "غلامی" کے مسئلے میں ہمارے علماء کا یہی حال ہے۔ چونکہ پہلے کے فقہاء نے ایسا ہی کہا ہے۔ اس لئے اب کے علماء بھی یہی کہہ رہے ہیں اور کوئی سوچ بچار کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ آمادہ ہوں کیسے جبکہ اس تقلید کے سبب مفت کے غلام ملتے ہیں اور مفت کی ایسی بیوی آتی ہے۔ جس سے نہ نکاح کرنا پڑے اور جس کو نہ مہر ادا کرنا پڑے؟ بہر حال سورۂ محمد کے پہلے رکوع میں کفار سے جنگ کے سلسلے میں ایک آیت ہے کہ اگر وہ لڑنے پر آمادہ ہوں۔

فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ

"تو ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب تم ان کی خونریزی کر چکو تو خوب مضبوط باندھ لو"

اسلامی معاشرت — مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ — قیمت دو روپے

[1] اخلاق، اسلام بلکہ عام انسانیت سے بھی گرا ہوا فعل ہے [2] بجائے خود یہ بات جاننا بڑا نہیں کہ بزرگوں نے کیا کہا اور لکھا ہے مگر ان متقدمین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ عجیب زبردستی ہے کیونکہ وہ انسان تھے۔ اور غلطی تقاضائے بشریت۔

مسند امام احمد بن حنبل رح

(علامہ تمنا عمادی پھلواروی)

(۲)

اس اہم تحقیقاتی مضمون کی پہلی قسط طلوع اسلام کی اشاعت بابت ۶ر اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اب دوسری قسط پیش خدمت ہے۔ طلوع اسلام

عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابوبکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے۔ ابن جوزی ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے۔ البتہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق کرید کریں۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہو گئے تھے۔ اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھے۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں، نہ تقریب میں نہ تعجیل المنفعۃ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی الاسماء والکنیٰ میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے ان کو کتاب الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام ختل میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی اس لئے ختلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ۔ لکھا ہے کہ عمر زیادہ پائی یہاں تک کہ دارقطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سبّ صحابہؓ لکھا ہوا پایا، تو انہوں نے فوراً اپنی براءت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے، ۳۵۴ھ میں مرے۔ دارقطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے الخ

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت

ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۹ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابوبکر اشنانی کا ترجمہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں۔ مگر دارقطنی نے ان کو دجال کہا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر شافعی ہی یہ ہیں جن کی دارقطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذریعے سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس نتیجے پر ان کے متعلق پہنچا ہوں وہ حسب ذیل ہے

موسیٰ بن سہل الوشّاء

یہ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے ابوبکر شافعی کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشاء تھے جن کو عقیلی نے غیر مشہور، دارقطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے ابن علیہ کے یہ آخری شاگرد تھے ۲۷۸ھ میں وفات پائی

محمد بن شاداد المسمعی

جب ابوبکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الٰہی محروم ہو گئے تو محمد بن شاداد المسمعی کی گود میں آگرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دارقطنی نے ضعیف ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابوبکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انہیں دونوں وشاء و مسمعی کی آغوش تربیت میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ میں ابوبکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے وشاء کی خدمت میں پہنچ گئے، یعنی ۱۲ سال ہی کی عمر سے۔ گذشتہ دو اساتذہ کے علاوہ محمد بن سعید البورقی

محمد بن سعید البورقی

کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔ یہ بورقی صاحب وہی ہیں، جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں، یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔ اور پھر محمد بن یونس الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں۔ ان کے بھی یہ نہایت خاص شاگرد ہیں

محمد بن یونس الکدیمی

ابوبکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ

اور اسی قسم کے چند اور مثلاً محمد بن احمد بن نصر ابوجعفر الترمذی، اسحٰق بن ابراہیم بن سنین الختلی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے۔ محمد بن ہارون بن برتیہ الہاشمی، سعید بن ہاشم الطبری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن الحسن بن محمد بن سماعۃ الحضرمی، ابراہیم بن محمد بن اسمٰعیل المسمعی البصری اور انہیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقہ فیض سے یہ استفاضہ کرتے رہے۔

مگر درحقیقت یہ بورقی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے تحت باہم تقسیم کار کرکے صحابہؓ و اکابر تابعین پر ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابوبکر شافعی تیار کئے گئے تھے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آ جائیں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوائیں تاکہ عامہ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا، تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں۔ مگر یہ ابوبکر شافعی صاحب اصل شیعہ امامیہ تھے اور تقیۃً اپنے

ابوبکر شافعی در اصل شیعہ تھے

کو شافعی مشہور کئے رہے اور تقیۃً ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر شافعی

ان ابوبکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی۔ انہوں نے اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابوالحسن تھی، اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابوبکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اسی طرح ابوبکر شافعی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام یوسف تھا مگر انہوں نے عبدویہ لقب دے کر اہل سنت میں مشہور کیا۔ اسی لئے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے۔ "محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب یکنّٰی ابا الحسن"[1]

خلاصۃ الاقوال میں ابوبکر شافعی

جیسا کہ خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرما کر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون هو ابوبکر الشافعی مولده سنة ۲۰۱ الحسینیة وکان علی الظاهر متفقهاً علی مذهب الشافعی وعلی رأی الشیعة الامامیة فی الباطن وکان فقیهاً علی المذهبین وله علی المذهبین کتب" یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابوبکر شافعی ہیں۔ ان کی ولادت حسینی[2] سال کے حساب سے ۲۰۱ھ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے مگر باطن میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال ص۔

منتہی المقال میں ابوبکر شافعی

اور دوسرے شیعہ محدث امام فن رجال ابو علی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر الشافعی هو محمد بن یوسف کذا فی المجمع ولعله ینسب تارة الی ابیه وتارة الی جده وذکره من طبقة ثقاتهم" یعنی ابوبکر شافعی وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب المجمع میں ہے۔ شاید ان کی نسبت کبھی ان کے باپ کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف" یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا اور کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو ثقہ و مجہول کے طبقہ میں ذکر کیا ہے۔

---

[1] یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابوالحسن ہے جیسا کہ ابتدائے ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔ [2] حسینی سال کی تفصیل میری کتاب تطہیر آیت التطہیر میں ہے مختصراً اتنا کے حاشیہ پر دیکھئے۔

علامہ مجلسی کی الوجیزہ

علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں "محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتب رجال میں کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے، وہ ممدوح کا مخفف ہے۔ خود مصنفین کتب رجال شیعہ نے اس کی تصریح کردی ہے، دیکھئے وجیزہ صفحہ ۱۶۲۔ مگر اسی رسالے کے باب الکنی میں ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی لکھکر وہی علامت ح کی بنا دی ہے جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے، اور ابوبکر شافعی کا ذکر باب الکنی میں نہیں کیا۔

ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی

شرح تصریحات علمائے شیعہ

علامہ حلّی اور صاحب منتہی المقال نے ابوبکر شافعی کی نشان دہی کی، مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا، صاف کھا گئے! ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی لکھکر اس طرح اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابوبکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابوبکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب ہی کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ ابوبکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلۂ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اس طرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کو ان کے دادا کی طرف۔ مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، ان کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلّی سال ولادت لکھتے تو ہیں مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے اس سے گریز کر کے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی سال حسینی[سلہ] کے حساب سے، جس سے علمائے اہل سنت تو کجا، شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں۔ اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں الٹ پلٹ شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے تو جواب میں کہہ دیا جائے کہ نہیں تو شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے۔ چنانچہ دونوں کے ناموں میں کافی فرق موجود ہے۔ آپ کا ابوبکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے جس کی ولادت سنہ ۲۶۰ھ کی اور ہمارا ابوبکر شافعی محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف ہے جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے باقی رہا سال حسینی، تو اگر امام حسینؓ کی ولادت سے بھی لیجئے تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے، اس لئے یہ دوسرے ہی ابوبکر شافعی ہیں جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا، مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔ اس طرح کی

علمائے شیعہ کی تدلیس

تدلیس شیعہ حضرات ہمیشہ کرتے رہتے ہیں، مثالاً ملاحظہ ہو۔

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے، مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدّل بن علی العتری لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدّل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور العتری تائے مثناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مندل کے حقیقی بھائی حبان بن علی الغزی کو صرف حبان بنا کر تصریح کر دی کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے درج ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جا سکے گا۔ مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحاء المہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی ربع میں موجود ہوگا۔

حبان بن علی الغزی

اسی طرح ابوجعفر بن جریر بن یزید الطبری جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے۔ ان کو ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھدیا، تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ سمجھے، اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالاں کہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں وہ عام نگاہوں سے اس وقت تک پوشیدہ رہیں جب تک ایران میں صفویہ حکومت قائم نہ ہوئی تھی جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خالص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانہ کتمان ہی میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ و روپ میں نمایاں ہو گئے، اس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے اہل سنت بدظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر و تاریخ میں کر گئے ہیں بار آور نہ ہو سکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کر دیں، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علماء و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے اہل سنت میں زبانی اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے اور یہ ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر کسی چیز کو ہم فلاں فلاں صحیح اور حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے نہیں مگر رد کر دیتے ہیں۔ یا مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے ہم ان صحیح و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کر لیں گے۔ یہاں تک کہ بر بنائے ضرورت اس کی واقعیت ہی سے انکار کر دیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی مگر ہے تو حلوائے بادام۔ اس کی زہر آلودگی سے انکار کر کے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں تو اس کا مزا تو آتا رہے گا۔ ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود سمجھ کر واپس کر دینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کر کے کہ ہائے کیا خوش رنگ اور خوشبودار حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے گلے لگایا اور مسند امام احمد کو بھی اور اسی طرح سنن نسائی مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد

غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابوبکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہو گئی، کہ یہ شخص درحقیقت شیعہ تھا اور تقیہ کر کے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر وہ کدیمی اور بورقی والی پارٹی تھی، جو درحقیقت بالکل اسی کی طرح تقیہ باز تھی اور وہ سب کے سب شیعے ہی تھے

تصریح سلسلۂ تالیف مسند

مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جھوٹی سچی جمع کردہ روایات کو یکجا کر کے پورا ذخیرہ حدثنا عبداللہ حدثنی ابی لکھ کر مرتب کر ڈالا۔ وہ یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلّی نے ان کے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے۔) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کر لیں۔ مگر فوراً اس کی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کر کے راہی جنت نہ ہو لئے اس وقت تک کسی سے مسند امام احمد کا نام تک نہ لیا گیا۔ یہاں تک کہ اسی انتظار میں ابوبکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسے جلیل القدر محدث متوفی سنہ ۳۶۰ھ عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابوبکر شافعی نے مرتے وقت ابوبکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کر دی اور بزبان حال کہا کہ۔

سپردم بتو مایۂ خویش را الخ

قطیعی تو ابوبکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے اور انھیں کی تربیت یافتہ و ہم مسلک و ہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے یعنی برابر ترتیب مسند میں بھی ابوبکر شافعی کے معین و مددگار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا، اور اب کام ہی کیا تھا۔ پکی پکائی کھیر تو سامنے تھی، صرف کھا لینا تھا۔ طبرانی کے انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر گھومنے لگے مگر پھر بھی کہیں مسند امام احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں

سلہ سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولینا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی سے اور ان کو نواب محسن الملک سے معلوم ہوا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ انہی نے اس کی پوری تفصیل اپنے رسالے تطہیر آیت التطہیر عن دنس ہفوات الرواۃ فی التفسیر میں لکھدی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبویہ سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں۔ اور جس کی بنیاد ایک خواب تا ہے جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسینؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفاء و کتمان بھی فرض ہوا اور سال حسینی کا اخفاء بھی۔ مگر زندگی بھر جس واقف کا ہر دن پر دو ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بنا پر علامہ حلّی نے یہاں استعمال کر لیا۔

پڑتی تھی۔ اپنے کو عبداللہ بن احمد کا شاگرد بھی مشہور کر ہی چکے تھے اور لوگوں نے تسلیم بھی کر لیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں ان سے سنی ہوں گی۔ ۱۴۰ ۔ ۱۶ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابوبکر شافعی کو یہ ابوبکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابوبکر قطیعی کو بھی "جوئندہ یابندہ" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا، جو درحقیقت منافقت میں ابوبکر شافعی اور ابوبکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابوبکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع گزر جانے کے بعد دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اس لئے ادھر اُدھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد ابن المذہب کے دامِ تزویر میں کب آ سکتا تھا اگر واقعۃً خطیب کو ابن المذہب پر کچھ بھی اعتماد ہوتا، تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر خدا جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لیے ہوتے، مگر کسی نے بھی ان کے اس دعوےٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت نہیں، یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت ان کی تکذیب کر کے دکھا دی . . . . ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے، مگر زبانی تکذیب بھی ضرور تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لیے پھرے مگر کسی نے بھی توجہ نہ کی۔ آخر اپنے دونوں اگلے متقداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابوالقاسم ہبۃ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہو گئے اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا۔ ساری عمر مسند احمد کو ہر جگہ ڈھوئے ڈھوئے پھرے مگر علمائے حدیث میں ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعت مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے، چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی، تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی، جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد تو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر ابن ہبۃ الرصافی کے سوا ہبۃ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مشتبہ آحاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں

محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں۔ ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ان سب عہدوں میں صرف ایک یا ایک ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آتے ہوں، تو وہ حدیث صرف آحاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی، بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحاد ظنی اور آحاد مشتبہ اور دونوں کا فرق

عہد صحابہؓ یا تابعی یا تبع تابعی میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو، یا دو زمانوں میں، تو دوہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہو گی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جاننے والوں اور روایت کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ ضرور ہونی چاہئے مثلاً ۱۔ وہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو، اس لئے اس پر اس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہئے۔ ۳۔ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دے دو۔ ۴۔ کسی خاص جماعت یا عامۂ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵۔ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶۔ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو، تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷۔ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیرہ ذٰلک۔

اس قسم کی روایت کا صرف کسی ایک ہی صحابیؓ سے مروی ہونا ضرور شبہے میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہؓ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں دریافت کیا؟ اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محلِ اشتباہ ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہؓ و تابعی سب کا تعدد ہو مگر سب سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں، تو یقیناً اشتباہ دُہرے ہونے کی وجہ سے مؤکد ہو جائے گا۔ اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہے؛ جب تو تہرے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روایتیں اپنے مراتبِ اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہوں گی۔ اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائے گی اور ضرور واجب الترد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ما تشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گمراہوں کی بتائی گئی ہیں، اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ وَإِيَّاكَ وَالْمُشْتَبِهَاتِ، یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب وہ ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی احادیث سے پہنچا ہے، جس کی احادیث کا سلسلہ تین سو برس تک متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک یکے بعد دیگرے بلا شرکتِ دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آ رہا ہے اور تقریباً تین سو برس کے بعد بھی جو وحدت آحادیت ٹوٹتی ہے اور تعدد شروع ہوتا ہے۔ تو اس دور تعدد کا ہر راوی اس غیر معمولی آحادیت کو تسلیم کئے ہوئے اور اس پر پوری طرح قائم ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اس غیر معمولی آحادیت کے پہاڑ سے ٹکراتے رہنے کے باوجود اس کے شیشۂ استغنا پر معمولی سے معمولی اور خفیف سے خفیف بال پڑنے کا گمان بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے صرف نام کی اسی قسم کی نادر ساحرانہ برکت ہے، جیسی کہ سامری کو قبضۃ من اثر الرسول سے حاصل ہوئی تھی۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

مطبوعات طلوع اسلام

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

میں

راجہ برادرز

نیوز ایجنٹ و بک سیلرز

سے مل سکتی ھیں

۸ؔ مثلاً صرف عورتوں یا صرف مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر

حقائق و عبر

حکم حاکم

حکومت پاکستان نے جب روپیہ کی شرح مبادلہ کو بدلا ہے تو اس کے دوسرے ہی دن اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ حکم نامہ شائع ہوا کہ اس تبدیلی سے موجودہ اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس حکم کو پڑھ کر اطمینان ہوا کہ سردست انہی داموں پر چیزیں ملتی جائیں گی۔ لیکن اخبار کے اسی صفحے پر نیچے یہ خبر بھی درج تھی کہ کراچی کے کتب فروشوں اور ناشرین کتب نے ایک میٹنگ کی اور اس میں یہ فیصلہ کیا کہ بیرونی کتابوں اور رسائل وغیرہ کی قیمت میں پچاس فیصدی اضافہ کر دیا جائے۔ حکومت کے حکمنامے کے متعلق تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ لیکن، ان کے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی شام کتابیں اور رسائل ڈیوڑھی قیمت پر بکنے لگ گئے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ حکومت آئندہ اپنے فیصلوں کو دوکانداروں کی معرفت نافذ کیا کرے۔ کیونکہ دکانداروں کا فیصلہ تو اسی وقت موثر ہو جاتا ہے اور حکومت کا فیصلہ محض اخباروں کی جلی سرخیاں بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہمارے روپیہ کی شرح تبادلہ کم ہو گئی تھی اور روپیہ فی پونڈ ہوئی تھی تو اس زمانہ میں کراچی کے کتب فروشوں نے اپنی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اس کے لئے وہ دلیل یہ دیا کرتے تھے کہ ہماری یہ کتابیں مہنگے داموں کی منگوائی ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ تو انہی داموں پر فروخت ہوں گی۔ لیکن جب جدید شرح مبادلہ کے مطابق سستے داموں کی کتابیں آئیں گی تو انہیں سستی قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔ اس وقت ان کا یہ فیصلہ نافذ العمل ہوا اور اب جب شرح مبادلہ بڑھ گئی، تو انھوں نے اپنے موجودہ اسٹاک کی قیمتیں بھی ساتھ ہی بڑھا دیں۔

یہ بات کچھ کتابوں تک ہی محدود نہیں۔ تمام چیزوں کی قیمتوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

بے حیائی کی حد بندی

ہمارے معاشرہ میں بے حیائی اور فحش کاری کو عام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ سنیما کا ہے۔ ایک ایک شہر میں درجنوں سنیما گھر۔ ایک ایک سنیما گھر میں تین تین چار چار شو روزانہ۔ ہر شو میں ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار تماشائی۔ ان میں بچے جوان، بوڑھے۔ لڑکیاں، عورتیں سب شامل ہیں اور ان کے سامنے بے حیائی کے ایسے مناظر اور جذبات انگیزی کے ایسے گیت جن کا آج سے بیس پچیس برس ادھر کوئی شریف انسان تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ان گیتوں کے ریکارڈ جو گراموفون باجوں پر اور ریڈیو کے ذریعہ شریف گھروں کی خلوتوں کے اندر تک جا گھستے ہیں۔ خیال تھا کہ شاید ارباب حکومت میں سے کبھی کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ مجھ سے کوئی اور نیک کام تو بن نہیں پڑا کم از کم میں اس بے حیائی کے سرچشمے ہی کو روک دوں۔ آج تک ہماری یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہمیں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں اس کا احساس ہے۔ کراچی کی اطلاع ہے کہ اگلے دنوں کچھ لوگوں کا ایک ڈیپوٹیشن چیف کمشنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان کی خدمت میں گذارش کی کہ جب ہندوستانی فلموں میں بوس بازی کی ممانعت ہے تو انگریزی فلموں میں سے وہ حصے کیوں نہیں کاٹ دیئے جاتے جن میں اس قسم کے عریاں سین آتے ہیں انھوں نے اس تجویز کو غور سے سنا اور اس سے اتفاق کیا کہ بے حیائی کی ان باتوں کی فی الواقع روک تھام ہونی چاہیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اس وقت انگریزی فلموں میں منہ چومنے کا سین تیس سکنڈ تک دکھایا جاتا ہے میں حکم دوں گا کہ یہ وقفہ زیادہ سے زیادہ دس سکنڈ تک محدود کر دیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس فیصلہ کا یورپ اور امریکہ میں عام اعلان ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان مادہ پرستوں کو معلوم ہو جائے کہ لادینی حکومتوں اور پاکستان کی اسلامی مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے اتنا ہی فرق جتنا تیس سکنڈ اور دس سکنڈ کی بے حیائی میں ہوتا ہے۔

ناخوشگوار فریضہ

ہمیں دھران (سعودیہ عربیہ) سے بعض قارئین طلوع اسلام کی طرف سے ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہم نے یہاں سنا ہے کہ آجکل جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور مجلس احرار کے علمائے کرام میں باہمی تھوکا فضیحتی ہو رہی ہے۔ دھران میں ایسے اخبارات نہیں ملتے جن میں ان چیزوں کی تفصیل درج ہو اور طلوع اسلام میں بھی ان کے متعلق کچھ لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ ہم لوگ ان دلچسپ چیزوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ہے کہ طلوع اسلام پوری تفصیل سے لکھے کہ یہ جھگڑا کیا ہے اور فریقین کی چپقلش کی نوعیت کیا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ پردیس میں ہر شخص کو اپنے دیس کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے اور وطن کی ہر بات دلچسپی سے سنی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ان دور افتادہ بھائیوں کا تقاضہ قابل فہم ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ جبہ و دستار کی چپقلش کی مقدس داستانوں میں وہ سب کچھ بھی آ جاتا ہے۔ جس کے متحمل طلوع اسلام کے صفحات نہیں ہو سکتے۔ پھر ان کا سلسلہ اتنا لامتناہی ہوتا ہے کہ

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

اور طلوع اسلام کے محدود سے دامن میں اتنی گنجائش کہاں؟

بہرحال ان حضرات کے تقاضۂ ذوق کے پیش نظر مختصر الفاظ میں اتنا بتا دینا شاید کافی ہو گا کہ ان حضرات کی باہمی آویزش کی بنیاد تحریک ختم نبوت کے زمانہ کے اندرون خانہ کے کچھ واقعات ہیں۔ ان کے متعلق سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ مودودی صاحب کے خلاف غلط بیانی سے کام لیں تو انھیں رسول اللہ کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان الزامات کی تردید بھی یہ کہہ کر فرمائی کہ اگر میں غلط کہتا ہوں تو مجھے بھی اپنے نانا کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اس سے آگے بات چلی تو مجلس احرار کے دیگر سربرآوردہ حضرات نے مودودی صاحب کے خلاف الزامات کی ایک فہرست شائع کر دی۔ اس وقت ایک مقدمہ مولانا احمد علی صاحب (شیراں والا گیٹ لاہور) اور مرتضیٰ احمد خاں صاحب میکش (مدیر نوائے پاکستان) کے خلاف جماعت اسلامی کی طرف سے لاہور کی عدالت میں دائر ہے اور ایک مقدمہ میکش صاحب کی طرف سے مودودی صاحب کے خلاف دائر ہے۔ جو مقدمہ جماعت اسلامی کی طرف سے دائر ہوا ہے اس کے عرضی دعویٰ میں انھوں نے منجملہ دیگر امور یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ اس وقت کیا گیا ہے جب کہ بقر عید قریب آ رہی ہے۔ اور اس سے منشا یہ ہے کہ ہمیں قربانی کی کھالیں نہ ملیں۔ اور اب عید کے بعد ان کی طرف سے یہ پر مسرت اور قابل فخر اعلانات ہو رہے ہیں کہ ہمیں اللہ کے فضل و کرم سے اس مرتبہ اتنی کھالیں ملی ہیں جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں۔

خدا گر بہ حکمت ببندد درے
کشاید ز فضل و کرم دیگرے

ذاتی ملکیت
کا اصول
ملا کے نزدیک بڑا مقدس ہے
لیکن
اس بارے میں قرآن کا حکم کیا ہے
اس کی تفصیل
"نظام ربوبیت"
میں دیکھئے

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد بمعہ گردپوش —— قیمت۔ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات —— قیمت —— آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات —— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات —— قیمت —— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات —— قیمت —— چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات —— قیمت —— چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات —— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی مٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات —— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات۔ قیمت —— چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد —— چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات —— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات —— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ —— قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول —— چھ روپے　قسم دوم —— (غیر مجلد) —— چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ دست کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ —— قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراج انسانیت —— ۲۵ فی صدی۔ دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی (۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی۔ (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔ (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے بعد وضع کمیشن سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی

نوٹ:۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات، و تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۱ء	مئی تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے خریداران طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام —— کراچی

نقد و نظر

۱۔ نماز از روئے قرآن

آج سے کچھ عرصہ پہلے پنجاب میں رجعت الی القرآن کی ایک تحریک جاری ہوئی تھی جس کے بانی چکڑالہ ضلع میانوالی کے مولانا عبداللہ صاحب تھے۔ ان کی تحریریں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں قرآن کی عظمت اور خالص خدا کی اطاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ اسکی شدت سے مضطرب و بیتاب رہتے تھے۔ ان کی ساری عمر قرآن کی نشر و اشاعت میں گزری۔ لیکن ان کے سامنے قرآنی نظام کا تصور نہ تھا۔ ان کی نگاہ قرآن کے خفقہ پر تھی یعنی مسلمانوں کی ہر مرد کی انفرادی زندگی کے متعلق قرآنی احکام پر۔ اس باب میں انہیں ایک بنیادی غلطی لگی۔ جس کی وجہ سے ان کی عمر بھر کی کاوش کوئی تعمیری نتائج مرتب نہ کر سکی وہ غلطی یہ تھی کہ انھوں نے سمجھا کہ زندگی سے متعلق تمام احکام کی جزئیات تک بھی قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے تمام قوانین کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اس لئے انھیں تمام جزئیات کو قرآن سے نکالنے کے لئے بڑی دور از کار تاویلات سے کام لینا پڑا۔ اسی ضمن میں انھوں نے نماز کی جزئیات کو بھی اپنی دانست میں قرآن سے مرتب کرنے کی کوشش کی اور اس طرح نماز کی ایک ایسی شکل تجویز کی جو ہماری مروجہ شکل سے بعض باتوں میں مختلف تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریک ایک فرقہ بنکر رہ گئی۔

ہمارے پیش نظر ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے جسے غلام احمد قریشی صاحب وثیقہ نویس کچہری ضلع پشاور نے شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے نماز کی جزئیات کو قرآن سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً یہی وہ جزئیات ہیں جنھیں مولانا عبداللہ صاحب نے مرتب فرمایا تھا۔ یہ جزئیات کس طرح سے مرتب کی گئی ہیں اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ سورۃ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ واضمم الیک جناحک من الرھب (۲۸/۳۲) اس سے مولف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے چاہئیں اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس انداز سے مرتب کی ہوئیں جزئیات کو کس حد تک قرآنی کہا جائے گا۔ ایسی کوشش کا فائدہ تو کچھ ہے نہیں لیکن یہ چیز ملت میں مزید انتشار اور فرقہ بندی کا موجب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ "دعوت الی القرآن" کی ایسی مبارک آواز نیوں ناکام ہو کر رہ گئی۔

ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق دین کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کریم نے بالعموم اصولی قوانین دئیے ہیں ان اصولوں کی عملی شکلیں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائیں۔ رسول اللہؐ کے بعد اگر حضورؐ کی اتباع میں قائم کیا ہوا اسلامی نظام یہ دیکھے کہ کس وقت زمانے تقاضے ان جزئیات میں رد و بدل چاہتے ہیں تو منشائے قرآنی کے مطابق ان میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ اور اگر رد و بدل کی ضرورت نہ ہو تو وہ علی حالہٖ قائم رہتے ہیں۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر کے امت میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرے۔ البتہ ان میں اگر کوئی ایسی چیز معلوم ہو جو صریحاً قرآن کے خلاف جاتی ہو تو اس کے متعلق یہ کہکر آواز بلند کی جا سکتی ہے کہ اسے رسول اللہ کی طرف غلطی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں جا سکتا۔

بوذر غفاری کا مذہب

شائع کردہ سید احمد علی معتمد بزم ادب شہداد پور (سندھ)، ٹائپ کا چھاپہ، چھوٹا سائز ضخامت ۱۴۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ بلا جلد۔ اس کتابچہ میں رسول اللہؐ کے صحابی حضرت بوذر غفاریؓ کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں۔ طلوع اسلام کے صفحات پر حضرت بوذر غفاریؓ اور ان کی دعوت کا ذکر متعدد بار آ چکا ہے۔ اگرچہ آپؓ کی دعوت کی تفاصیل نہیں ملتیں لیکن جو مختصر سی کڑیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی ملتی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ قرآن کے نظام ربوبیت کے داعی تھے جس کی رو سے زراندوزی جائز نہیں قرار پاتی یہ امر موجب مسرت ہے کہ اب مسلمانوں کا رجحان اس نظام کو سمجھنے کی طرف ہو رہا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ہمیں "داعیٔ بوذری جماعت" کی طرف سے تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔

ان جذبات کے احترام کے باوصف جو اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت کا موجب ہوتے ہیں ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا انداز محققانہ اور داعیانہ کے بجائے کچھ افسانوی سا ہو گیا ہے جو نہ تو حضرت بوذر غفاریؓ کے شایان شان ہے نہ ان کی دعوت کے مناسب۔ نیز اس میں اس احترام کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا جو دور صحابہؓ میں باہمی اختلافات کے بیان کے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ مقامات بڑی احتیاط کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہمیں تاریخ میں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے تو ہمیں اس کا اظہار بیباکانہ کرنا چاہئے لیکن بیباکی کا ڈانڈا گستاخی سے نہ جا ملنا چاہئے۔ بشمول یہ بھی عرض ہے کہ کتاب کا نام "بوذر غفاری کا مذہب" کی بجائے "حضرت بوذر غفاریؓ کا مسلک" یا آپ کی دعوت ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ نیز اس جماعت کا نام بوذری کی بجائے کچھ اور ہوتا؟؟ تو بہتر تھا۔ کتاب میں طباعت کی اغلاط بکثرت ہیں جس کے لئے پریس کے منیجر نے معذرت پیش کی ہے۔

باب المراسلات

حدیث کے متعلق ایک وضاحت

لاہور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں کے مقامی اخبار المنیر کی حالیہ اشاعت میں جماعت اسلامی کے سابق امیر مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جسمیں انھوں نے حدیث اور سنت کے متعلق طلوع اسلام کے موقف کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دانستہ الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جسکی وضاحت کی ضرورت ہے وہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ حدیث کو پرکھنے کا معیار قرآن ہے اور بعض اوقات یہ کہتا ہے کہ حدیث کی صحت کے متعلق قرآن سے بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ آپ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

طلوع اسلام

جس مضمون کا آپ نے حوالہ دیا ہے اسکے متعلق ہم مدیر المنیر کی خدمت میں الگ خط لکھ رہے ہیں۔ جہاں تک اس نقطہ کا تعلق ہے جسے آپ نے لکھا ہے یہ بالکل صاف ہے۔ احادیث کے مجموعوں میں دو قسم کی حدیثیں ملتی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق حضورؐ کی ذاتی سیرت سے ہے اور دوسری وہ ہیں جو قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱)۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ اس حدیث کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ اس کا تعلق حضورؐ کی سیرت سے ہے۔ اسکی صحت و سقم جانچنے کے لئے قرآن کریم معیار ہے اسلئے کہ قرآن کریم شہادت دیتا ہے کہ ایک رسول جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ اس لئے ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کبھی رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتی۔

(۲)۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اس کی شرح اڑھائی فیصدی مقرر فرمائی۔ یہ پرکھنے کیلئے کہ حضورؐ نے واقعی اڑھائی فیصد کی شرح مقرر فرمائی تھی یا کچھ اور قرآن کریم معیار نہیں بن سکتا اسلئے کہ قرآن کریم میں اسکی شرح کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی جس طرح قرآن کریم کی روشنی میں بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے کبھی یہ نہیں کہا ہو گا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا، اسی طرح ہم قرآن کی روشنی میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضورؐ نے زکوٰۃ کی شرح کیا مقرر فرمائی تھی۔ لہٰذا قرآن کے جن اصولی احکام کی جزئیات رسول اللہؐ نے متعین فرمائی تھیں ان کی صحت و سقم کو قرآن کی رو سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ طلوع اسلام نے جب کہا ہے کہ ایک قسم کی احادیث کو پرکھنے کا معیار قرآن ہو سکتا ہے اور دوسری قسم کی احادیث کی صحت و سقم قرآن سے بھی پرکھی نہیں جا سکتی۔ تو اس سے اس کا مطلب کیا ہے یہ دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ اسبات کا فیصلہ امت کا وہ نظام کرے گا کہ جو علیٰ منہاج نبوت قرآنی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے

عالم اسلامی

مراکش کی صورت حال میں اصلاح کی جو توقعات پیدا ہوگئی تھیں وہ ختم ہوتی نظر آتی ہیں اور خونی ہنگاموں کے پھر سے بڑھ جانے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ ہنگاموں کا موجودہ دور خصوصیت سے ۱۴؍جولائی سے شروع ہے۔ یہ دن فرانس میں بیسٹیل ڈے کے نام سے مشہور ہے۔ اس تقریب پر فرانسیسی آبادکاروں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیکر اہل مراکش کے خلاف بلووں کی طرح ڈالی اور ان پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا۔ اس سے بڑی نازک صورت حال پیدا ہوگئی اور فرانس کے حکومتی حلقوں میں اسے گہری تشویش سے دیکھا گیا۔ ریذیڈنٹ جنرل گرینڈ وَل نے بجا طور پر ان ہنگاموں کے لئے سیاسی حالات کو ذمہ دار قرار دیا اور اس کا علاج یہ سوچا کہ مراکش کو مناسب اصلاحات دی جائیں۔ اصلاحات کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فرانس نے دو سال پیشتر سلطان محمد بن یوسف کو اسی وجہ معزول کر دیا تھا کہ وہ وطن پرستوں کے مؤید ہیں۔ ان کی بجائے ان کے ایک حریف کو سلطان بنا دیا گیا تھا کیونکہ وہ فرانس کے نزدیک زیادہ قابل قبول تھا۔ نیشنلسٹ مراکشی اس دن سے مسلسل ابن یوسف کی بحالی کا مطالبہ کرتے چلے آ رہے ہیں یہاں تک کہ اب یہ مطالبہ .... آزادی کے مطالبہ کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ فرانس وطن پرست سلطان کو بحال کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن اہل مراکش کا اشتعال دیکھ کر گرینڈ وَل نے یہ تجویز پیش کی کہ نہ معزول سلطان کو واپس لایا جائے نہ موجودہ سلطان کو بحال رکھا جائے۔ اس کے بجائے ایک ریجنسی کونسل قائم کر دی جائے اور اصلاحات کا نفاذ اس کی وساطت سے کرایا جائے۔ فرانس کا متشدد طبقہ اس درمیانی تجویز کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ ریذیڈنٹ جنرل کے منصوبہ اصلاحات کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ مراکش میں اس تجویز کو پسند نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ اس کے لئے ضرور تیار ہوگیا تھا کہ اگر اصلاحات وسیع ہوں تو انھیں آزما لیا جائے۔ لیکن فرانسیسی مخالفت نے انھیں مایوس سا کر دیا ہے۔

گرینڈ وَل کے مقابلے میں فرانسیسی وزیر اعظم مسٹر فارے نے اپنی طرف سے اصلاحات کے تین بنیادی اصول پیش کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) مراکش میں فرانسیسی مفاد کا ہر نوع تحفظ کیا جائے۔ (۲) مراکش کو بتدریج انتظامی معاملات میں دخیل کیا جائے۔ (۳) ان جدید اداروں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی جائے جن کا مراکش کی طرف سے مطالبہ ہو رہا ہے۔ اور (۴) مراکش۔ فرانسیسی برادری بنائی جائے۔ یہ اصول بیان کر کے مسٹر فارے نے اہل مراکش کو جھنجھلا دیا ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ اصول مبہم ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً مراکش کو کیا اصلاحات دی جائیں گی۔ دوسرے معزول سلطان کی بحالی کا مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے اور اہل مراکش اس پر شدت سے اڑے ہوئے ہیں۔ اس اعلان کا فوری ردعمل کاروبار کے تعطل کی صورت میں ظاہر ہوا اور گو ابھی تک اس کی وجہ سے ہنگامہ کوئی نہیں ہوا لیکن اس نے صورت حال مخدوش کر دی ہے۔

۲۰؍اگست کو مراکش میں سلطان ابن یوسف کی معزولی کی دوسری سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ یہ دن امن و امان سے گزر جائیگا لیکن اب یہ خدشہ قوی ہوگیا ہے کہ اس دن پھر سے فسادات رونما ہو جائیں گے۔ فرانس کے وزیر اعظم اور مراکش میں فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل اس نزاکت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں کہ مراکش کے مسئلے کا حل فوری اور وسیع سیاسی اصلاحات میں ہے لیکن ان کی ملکی سیاست انھیں کوئی اطمینان بخش قدم اٹھانے نہیں دیتی۔ اگر فرانسیسی حکومت نے یہ موقع ضائع کر دیا تو مراکش میں قتال و جدال کا ایک نیا بازار گرم ہو جائیگا اور خود فرانسیسی حکومت برقرار نہیں رہ سکیگی۔

سوڈان کے وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ انتظامی مشینری کو سوڈانی بنانے کا مرحلہ مکمل ہوگیا ہے۔ چنانچہ اب اگلا اور آخری مرحلہ شروع ہوگا۔ معاہدہ کے مطابق اب ایک مجلس دستور ساز مرتب کی جائے گی جو یہ فیصلہ کرے گی کہ سوڈان مصر سے الحاق کریگا یا آزاد ہوگا۔ سوڈان کی موجودہ پارلیمان ۱۶؍اگست کو ایک قرارداد پاس کر کے مجوزہ مجلس دستور ساز کے لئے انتخابات کا سلسلہ شروع کر دے گی۔ یہ انتخابات ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں طے پائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ مصر اور برطانیہ دونوں اس کمیشن میں شریک نہ ہوں تاکہ انتخابات پر وہ کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ مصر سے آمدہ بعض اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے روس اور یوکرائن کو نامزد کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن اگر ایسا ہوگیا تو اشتراکی اثر بہت دور تک پھیل جائیگا۔ بدقسمتی سے مصر نے ان دنوں خصوصیت سے ماسکو کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ۲۳ جولائی کو مصر کے فوجی انقلاب کی تقریب سالگرہ منائی گئی تو اس میں ماسکو کے پراودا اخبار کا ایڈیٹر بھی مدعو کیا گیا تھا اور اب یہ اعلان ہوا ہے کہ کرنل ناصر آئندہ سال موسم بہار میں روس جا رہے ہیں۔ یہ آثار یقیناً خوش آیند نہیں۔ ان دعوتوں اور آمد و رفت سے مشرق وسطیٰ کا دروازہ اشتراکیت کے لئے چوپٹ کھل جائے گا اور جب اس کے نتائج کا وقت آئیگا اس وقت ان کو بھی کف افسوس ملنا پڑیگا جو اس وقت سادگی سے یہ دروازہ کھولنے میں لگے ہوئے ہیں۔

بین الاقوامی جائزہ

عالمی سیاست بدستور جنیوا کی چوٹی کانفرنس سے مسحور ہے جگہ جگہ مفاہمت و مصالحت کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں اور بین الاقوامی رواداری اور تعاون کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ جنیوا کانفرنس کے خاتمہ پر امریکہ اور چین کے مابین براہ راست مذاکرات شروع ہو جانے سے مصالحت پسندی کی فضا مشرق بعید تک پہونچ گئی ہے۔ یہ مذاکرات جنیوا میں یکم اگست کو شروع ہوئے تھے۔ اور ابھی تک جاری ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چین نے اس سلسلہ میں مشرق بعید سے ایک عمومی معاہدہ کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ تصور جنیوا کے مذاکرات میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ علیحدہ طور پر یہ شوشہ چھوڑا گیا ہے۔ اس سے ایک حد تک یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرخ چین کے پیش نظر کیا کچھ ہے۔ روس نے یورپ میں بھی ایسے معاہدے کی پیشکش کر رکھی ہے لیکن اقوام مغرب نے اس سلسلہ میں کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ مشرق بعید میں بھی ان کی روش کم و بیش یہی رہے گی۔ فی الحال اس معاہدے کی توقع نہ یورپ میں کی جا سکتی ہے نہ ایشیا میں لیکن مذاکرات کا جو سلسلہ شروع ہوگیا ہے اس سے اچھے نتائج ضرور برآمد ہو سکتے ہیں۔

امریکہ اور چین کے مابین براہ راست مذاکرات شروع ہوئے تھے۔ تو ان کا نقطہ ماسکہ دونوں ممالک کے ان شہریوں کی واپسی تھا جو بوجوہ قید میں ہیں۔ چین نے اس سلسلہ میں قابل ذکر اقدام کیا ہے اور ان گیارہ ہوابازوں کو رہا کر دیا ہے جن کے لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے چین کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس رہائی سے استنباط کیا گیا کہ چین کے نزدیک گفتگو کا محور قیدیوں کی رہائی اتنا نہیں جتنا دیگر امور ہیں۔ یوں تو ان دیگر امور سے متعلق اعلان موجود ہے کہ وہ زیر بحث آئیں گے لیکن اب مذاکرات کا رخ ان کی طرف زیادہ ہوگیا ہے ان میں قابل ذکر مسئلہ فارموسا کا ہے جس پر کچھ عرصہ پیشتر جنگ تک کی باتیں شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے لئے متعدد قوموں کی مشترکہ کانفرنس کی تجویز بھی پیش ہوئی اور چین اور امریکہ کے مابین براہ راست گفتگو بھی۔ لیکن نیشنلسٹ چین کی شرکت یا عدم شرکت پر بات بگڑ جاتی رہی۔ امریکہ کو اصرار تھا کہ فارموسا کے نمائندوں کو ضرور شریک گفتگو کیا جائے اور چین انھیں نظرانداز کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اب جب کہ دونوں ممالک کے نمائندے باہم مل بیٹھے ہیں تو یہ ممکن ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث آئے۔

چین نے مفاہمت پسندی کا جو مظاہرہ کیا ہے اس سے یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ امریکہ جلد اس کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کرلے گا۔ اس خوش فہمی کی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے لیکن ہنوز یہ منظوری قبل از وقت ہے چنانچہ صدر آئزن ہاور نے یہ صاف کہہ دیا ہے کہ ان کا ارادہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین اسے اپنی مطلب برآری کا ذریعہ نہیں بنائے گا۔ وہ امریکہ کو پوری طرح یقین دلانے کی کوشش کریگا کہ اس کے عزائم امن پسندانہ ہیں اور وہ اقوام متحدہ کے مقصد و مسلک کو قبول بھی کرتا ہے اور اس پر قائم بھی رہے گا۔ چین انہی طریقوں سے اقوام متحدہ تک پہنچ سکتا ہے امریکہ بہرحال یہ قیمت آسانی سے نہیں دے گا۔

چوٹی کی کانفرنس نے چاروں ممالک کے وزرائے خارجہ کی جس کانفرنس کا فیصلہ کیا تھا وہ ۲۷؍اکتوبر کو منعقد ہو رہی ہے ان کی کانفرنس سے صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ جنیوا کانفرنس

نے جو بیج بویا ہے اس میں کونسا پھل آنے لگا۔ صدر آئزن ہاور نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک دوسرے ممالک کا ہوائی فوجی معائنہ لیا جائے یعنی ان ممالک پر اڑ کر تصویریں لی جائیں۔ اور پھر ان کے مطابق جنگی قوت کا تخمینہ لگایا جائے۔ مارشل بلگانن نے ایک دن تو اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ناقابل عمل ہے لیکن دوسرے دن انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جنگی قوت کا اندازہ لگانے کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ آئندہ بھی ایسا معائنہ کیا جا سکے اور اس قوت کے اضافے کو روکا جا سکے۔ یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور آج تک اس مسئلہ پر کسی قسم کا اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ لیکن اب پھر ان خطوط پر کام شروع ہو گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی متفقہ لائحہ عمل تیار ہو جائے۔ روس نے ان دنوں یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی فوج میں چھ لاکھ چالیس ہزار کی کمی کر دے گا۔ اس پر فوراً دسمبر کو عمل درآمد ہوگا یوں پہل کر کے روس نے گویا اقوام مغرب کو مجبور کرنا چاہا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کی کمی کا اعلان کریں لیکن اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ اب تک تقریباً یہ صورت ہے کہ تعداد کے اعتبار سے روس کے پاس فوج زیادہ ہے وہ اس میں کچھ کمی بھی کرے گا تو اس سے اقوام مغرب پر عددی برتری کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے برعکس اقوام مغرب اپنی فوج کی تعداد کم کریں گی تو انھیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس اعلان کا امریکہ اور برطانیہ میں اثر ضرور ہوا ہے کہ روس عالمی کشیدگی کم کرنے کے لئے عملی اقدامات کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس فضا میں تحدید اسلحہ کے مذاکرات زیادہ اطمینان اور دلجمعی سے طے ہو سکیں گے اور یہ اکتوبر میں ہونیوالی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے لئے نیک فال ہے۔

خودکشی اور اسلامی دستور

(صـ ۶ سے آگے)

> خزانہ کرنے کے بجائے اسے غرباء کے مصرف میں
> اس طرح سے دے دیا جائے گا جس سے ان
> کے دنیا جنت بن جائے گی

اس کے بعد وہ یہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

> اس موضوع پر اسلامی تعلیمات میں کچھ ابہام نہیں اہل علم جانتے ہیں کہ دین مبین میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے مرتکب کے لئے وعید وارد ہے کہ وہ عالم برزخ میں اور حشر کے بعد اسی عذاب میں مبتلا رہے گا جس میں اس نے غلطی سے عمداً یا جان بوجھ کر اپنے آپ کو مبتلا کر لیا تھا۔ زہر کھانے والا بار بار زہر کھائے گا۔ اور مر مر کر جیے گا خنجر سے کام تمام کرنے والا خنجر ہی گھونپتا رہے گا اور پھندا لگا لینے والا پھانسی ہی پاتا رہے گا۔ گویا جان جان آفریں کی ہے جس نے دی ہے۔ اسی کا کام ہے کہ وہ اسے واپس بھی لے دیگر فرائض کی طرح اس کی حفاظت کرنا بھی خدا اور نفس کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والے حقوق کی طرح ایک فرض ہے۔ افسوس اس بات پر آتا ہے کہ باوجود اتنا ظاہر حکم اور فیصلہ موجود ہونے کے ہوتے اس کی تبلیغ میں مجرمانہ غفلت کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے خطیبوں اور واعظوں کے خطبوں اور وعظوں میں کتابی مسائل کے لچھے کے لچھے پھیلتے جائیں گے دورازکار قصے، کرامات اور معجزات کو شیریں خوانی کی چاشنی سے ہم مزے مزے لے کر منبروں سے نشر کریں گے لیکن حالات حاضرہ پر کچھ فقرات پیدا کرنے سے ہماری گویائی عاجز اور عملی زندگی کی خرابیوں کا تصور پیدا کرنے اور ان سے عوام کو باز رکھنے کا موثر اسلوب اختراع کرنے میں ہماری تخیل سقیم ہو کر رہ گئی ہے۔

آپ نے علاج ملاحظہ فرما لیا! یعنی معاشرہ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایسے حالات پیدا ہی نہ ہونے دے جس سے تنگ آکر فاقہ کش، نادار، بیمار خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خودکشی ایک جرم ہے۔ لیکن جس اسلام نے ایک فاقہ کش کو اضطراری حالت میں حرام تک کھا لینے کی اجازت دی ہے کیا اس کے ہاں ایک ایسے نادار کے لئے جس کے پاس نہ پیٹ بھر کر کھانے کے لئے روٹی ہو، نہ اپنی بیماری کے علاج کے لئے پیسہ اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ اس غریب سے وعظ کہے جائیں لیکن جو اس کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں انھیں اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت سمیٹتے چلے جائیں بشرطیکہ وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال کر ان فتوے دینے والوں کی مفت خوری کا انتظام کرتے رہیں!

یاد رکھیئے یہی ہے ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ وہ اسلام جو دنیا میں کمیونزم کے جہنم کو اس تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ سے کوئی فضا بھی محفوظ نہیں نظر آتی۔ اگر پاکستان میں اس قسم کے ارباب شریعت کا تجویز کردہ اسلامی دستور نافذ ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اس کے دروازے کمیونزم کے جہنم کے لئے چوپٹ کھل جائیں گے اور اس وقت (عام مسلمانوں پر تو جو بیتے گی بیتے ہی گی) خود وہ تمام قوتیں جو آج کمیونزم کی روک تھام کے لئے اس قدر روپیہ صرف کر رہی ہیں دانتوں میں انگلی دبائے بصد حسرت و یاس کہہ رہی ہونگی کہ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ (۲۸/۶۹)۔ ہم نے اتنی دولت ناحق ضائع کی!

باب المراسلات

(صفحہ ۱۶ سے آگے)

قایم ہوگا، کہ زکوٰۃ کی موجودہ شرح جس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی جاتی ہے علی حالہ باقی رکھی جائے یا اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں رد و بدل کیا جائے۔ بظاہر ہے کہ اس نظام کے سامنے سوال یہ نہیں ہوگا کہ یہ احادیث جن میں یہ شرح مقرر کی گئی ہے صحیح ہیں یا غلط۔ اس کے سامنے سوال یہ ہوگا کہ یہ شرح ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔ اگر یہ پورا کرتی ہے تو اس شرح میں کسی رد و بدل کی ضرورت نہیں ہوگی اور اگر یہ پورا نہیں کرتی تو یہ نظام اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق اس میں ضروری تغیر و تبدل کر دے گا بشرطیکہ یہ تبدیلی قرآن کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر ہو۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح ۔ ۔ ۔

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نئی مجلس دستور ساز

بننے سے پھر یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستان کا آئین کیا ہوگا۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن اس کا جواب؟ ۔ ۔ ۔ اس کے لئے دیکھئے ۔

قرآنی دستور پاکستان

جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے مطابق دستور پاکستان کیا ہوسکتا ہے؟ مملکت پاکستان کے لئے اسلامی آئین مرتب کرنے کی پہلی اور منفرد کوشش۔ اس میں ان کوششوں کا محاکمہ بھی ہے جو دستور مرتب کرنے کے سلسلہ میں حکومت اور علماء کی طرف سے کی گئی ہیں۔ یہ دستور اور متعلقہ مباحث کی ایسی مکمل کتاب ہے جس کا مطالعہ آئین میں دلچسپی لینے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔

صفحات ۲۲۴ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی ۳۰

مفاد خویش

پیش نظر ہو تو انسان جمع کئے جاتا ہے لیکن اس کا

پیٹ نہیں بھرتا ۔

وہ سمجھتا ہے
کہ یہی مال و دولت اسے حیات جاودانی عطا کردے گا ۔
اس کی نگاہ مفاد عاجلہ پر ہوتی ہے اور وہ

مستقبل کی خوشگواریوں

کو نظر انداز کردیتا ہے ۔
اس معاشرے میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ ہوجاتا ہے
اور ہر شخص اپنے مفاد کے حصول میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ

اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی ۔

اس کا نتیجہ وہ

تباہیاں

ہیں جو اس وقت دنیا بھر کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ قرآن ان
تباہیوں سے بچنے کا ذریعہ بتاتا ہے ۔ کیسے ؟

اس کی تفصیل آپ کو

✡ نظام ربوبیت ✡

(از ۔ پرویز)

میں ملیگی جو دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے ۔

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش ۔ چھہ روپے

قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ ۔ چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ۔ کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM